National Council for Promotion of Urdu Language

www.urducouncil.nic.in

قیمت: ₹10/-

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

فروری 2021

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ **بچوں کی دنیا** دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

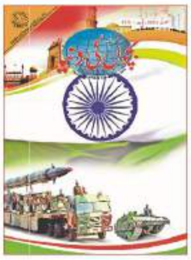

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

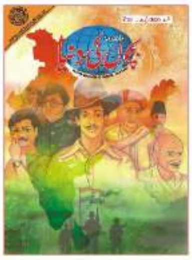
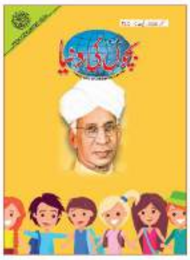

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

اُردو آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان
ماہنامہ خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 5 شمارہ: 2 فروری 2021

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی
مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم بحکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی۔ 110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: **64** Total Pages

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
روبرو	ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا سے انٹرویو	زیب النساء	5
شخصیت	تعلیم نسواں کی علمبردار: رقیہ سخاوت حسین	حدیثہ افضل	8
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		13
جہان نسواں	کلام سرور جہان آبادی میں تذکرۂ خواتین	ڈاکٹر معین الدین شاہین	14
	ہندوستان میں خواتین کی تعلیم	ڈاکٹر ریاض احمد	18
	مشائخ چشت کا نظام اصلاح و تربیت	انیسہ خاتون	25
	سلمیٰ صنم کے افسانوں میں سماجی شعور	ڈاکٹر ارشاد شفق	31
	عصری اردو افسانہ اور شائستہ فاخری	صدام حسین	36
	اردو انشائیے کی معنویت	درخشاں پروین	40
کہانیاں	چھن	نصرت شمسی	44
	احساس قتل	رشدہ شاہین	46
حسن سخن	شاہین زیدی، یسریٰ راحت، آفرین محمود		52
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		54
صحت	Covid-19 کی تازہ لہر اور قوت مدافعت	ڈاکٹر اشرف آثاری	56
آرائش وزیبائش	حسن کی نگہداشت		59
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		61
خواتین خبرنامہ			62

مشعل

ہندوستان میں مختلف زبانیں اور بولیاں ہیں۔ زبانیں بولیوں کا ہی نکھرا روپ ہوتی ہیں۔ وہی زبانیں زندہ وتابندہ سمجھی جاتی ہیں جو عصری مطالبات اور تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ گلوبل ولیج میں آج بہت سی زبانوں کو خطرات لاحق ہیں۔ بہت سی ایسی زبانیں اب معدوم ہو چکی ہیں جن میں علم وادب کا وافر ذخیرہ تھا۔ یہ زبانیں کیوں ختم ہوئیں، اس کے کیا اسباب ہیں اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

موجودہ عہد سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے۔ اس جدید دور میں ہم ٹیکنالوجی اور سوشل نیٹ ورکنگ کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ زبانوں کا تحفظ بھی ٹیکنالوجی سے ہی جڑا ہوا ہے جو زبانیں ٹیکنالوجی سے جڑی ہوئی ہیں وہ بہت تیزی سے ترقی کر رہی ہیں اور ان کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ مقام شکر ہے کہ اردو زبان بھی ٹی وی، موبائل، فیس بک اور جدید ٹیکنالوجی سے جڑی ہوئی ہے مگر اس میں مزید وسعت کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اردو کے بہت سے اخبارات اور رسائل آن لائن بھی شائع ہو رہے ہیں۔ اس کے ذریعے بھی اردو کے فروغ کی راہیں آسان ہو رہی ہیں۔ مختلف علوم وفنون کے ترجمے اردو زبان میں ہو رہے ہیں اور اردو میں سائنسی تکنیکی ادب کا بھی ایک اچھا ذخیرہ ہے اس طرح اردو زبان کے تحفظ اور بقا کی صورتیں تو موجود ہیں مگر ہمیں اردو کی بنیادی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دینی ہے کیونکہ جب بنیادیں مضبوط نہیں ہوں گی تب تک زبان کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ ہمیں اور بھی بہت سے چیلنجز کا سامنا ہے ان پر بھی غور وفکر کرنا ہے اس تعلق سے ہمارے بہت سے ماہرین مشورے اور تجاویز پیش کر چکے ہیں انھیں عملی جامہ پہنانے کی شدید ضرورت ہے۔

ملک میں بہت سی اردو اکیڈمیاں اور ادارے ہیں جو اردو کے فروغ اور ترویج واشاعت کے لیے مقدور بھر کوششیں کر رہی ہیں۔ قومی اردو کونسل بھی اردو کا ایک اہم ادارہ ہے جس نے مختلف سطحوں پر فروغ اردو زبان کی جو کوششیں کی ہیں وہ کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ مختلف اسکیموں کے ذریعے اردو زبان کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں یہ ادارہ کوشاں رہا ہے۔ اردو زبان کی تعلیم وتدریس کو کمپیوٹر سے جوڑ کر پورے ملک میں کمپیوٹر کے سیکڑوں مراکز قائم کیے ہیں ان سے فیض پانے والے طلبہ روزگار سے جڑ بھی رہے ہیں۔ فاصلاتی تعلیمی اسکیم کے تحت اردو میں سرٹیفکیٹ ڈپلومہ کورسز کرائے جاتے ہیں۔ پورے ہندوستان میں اس کے مراکز قائم ہیں اس کے علاوہ آن لائن اردو لرننگ پروگرام ہیں جس سے دنیا بھر کے تیس سے زیادہ ممالک کے افراد فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اور کئی اسکیمیں ہیں جس سے اردو زبان کو فروغ مل رہا ہے لیکن فروغ اردو کے لیے محبان اردو کو بھی آگے آنا ہوگا تبھی اردو زبان کا مکمل تحفظ اور فروغ ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ اردو زبان سے محبت کرنے والے ضرور اردو کی ترویج واشاعت کے لیے ہر سطح پر ادارہ کا تعاون کریں گے۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا سے انٹرویو

زیب النساء

کتابیں

(1) فرہنگ کلیات نظیر اکبر آبادی (2) ٹوٹا ہوا آدمی
(3) یادرفتگاں (4) مانو یا نہ مانو (5) محفل میلاد النبی
(6) آٹھ راتیں سات کہانیاں (7) شجر سایہ دار
(8) دھوپ کے ساتوں رنگ (9) نازش جنوں
(10) پھر کیا ہوا (11) قرآن سعدین

انعامات

(1) دہلی اردو اکادمی (2) اتر پردیش اردو اکادمی
(3) بہار اردو اکادمی (4) بزم میکش (5) یاد میکش ایوارڈ
(6) انڈو پاک تنظیم احساسات (7) ساہتیہ شبلی ایوارڈ

س: آپ کا اصل وطن کہاں ہے؟

ج: میری پیدائش جے پور راجستھان میں ہوئی جہاں میرے والد سید احمد علی شاہ جعفری بحیثیت سول سرونٹ پوسٹڈ تھے۔ لیکن میرا آبائی وطن آگرہ ہے۔

س: کیا آپ کے والدین کا بھی اردو ادب سے کوئی تعلق رہا؟

ج: میرے والدین نثر نگار بھی تھے اور صاحب دیوان شاعر بھی تھے۔

س: آپ کو افسانہ نگاری سے کیوں اور کیسے دلچسپی ہوئی؟

ج: بچپن نانی اور دادی کی کہانی سنتے گزرا۔ والدہ کی گود میں بھی کہانیاں سنیں۔ کہانی میری سرشت میں شامل ہوگئی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی کہانیاں اور افسانے لکھنے شروع کر دیے۔ پہلی کہانی آٹھ سال کی عمر میں لکھی تھی اور پہلا افسانہ چودہ سال کی عمر میں رسالہ ’خاتون مشرق‘ میں شائع ہوا۔

س: کیا آپ نے ہندوستان کی دوسری افسانہ نگار خواتین سے بھی استفادہ کیا؟

ج: دیکھیے! سیکھنے سکھانے کا عمل تو ساری زندگی چلتا رہتا ہے کیونکہ مجھے بچپن سے کہانیوں اور افسانوں سے دلچسپی رہی ہے اس لیے ہندوستان کے بہت سے افسانہ نگاروں کو پڑھا۔ اردو کے بھی اور ہندی کے بھی۔ اس

میں خواتین اور مرد قلمکاروں کی کوئی تخصیص نہیں ہے یقیناً میں نے سبھی سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔

س: اردو افسانہ نگار کا سرخیل آپ کس کو مانتی ہیں؟

ج: اردو افسانے کے سرخیل تو بلاشبہ منشی پریم چند ہی ہیں۔

س: آپ کے افسانوں کی خصوصیات کیا ہیں؟ اور ان کا مرکزی کردار کیا ہے؟

ج: میرے افسانوں کی خصوصیات کیا ہیں یہ تو پڑھنے والے ہی بتا سکتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ میرے سب ہی افسانے حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

س: ہندوستان کی ممتاز خاتون افسانہ نگار اور کون کون ہیں؟

ج: یہ سوال بہت آسان بھی ہے اور بہت مشکل بھی، آسان اس لیے کہ افسانوی ادب کی مشہور و معروف خواتین قلمکاروں کو کون نہیں جانتا۔ بہت پرانی تاریخ چھوڑیے بیسویں صدی کے نصف آخر سے لے کر آج تک خواتین افسانہ نگاروں کی ایک پوری کہکشاں ہے۔ جن میں رشید جہاں، صالحہ عابد حسین، رضیہ سجاد ظہیر، آمنہ ابوالحسن، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، صغرا مہدی، مسرور جہاں، ہاجرہ مسرور، ناصرہ شرما وغیرہ

س: آپ کے افسانوں پر دوسری زبانوں کے ادبی اثرات کس حد تک ہیں؟

ج: میں نے شعوری طور کسی بھی زبان کے افسانہ نگار کو کاپی کرنے کی کوشش نہیں کی البتہ میں انگریزی کے بعض افسانوں نگاروں سے متاثر رہی ہوں۔ جن میں او۔ ہنری اور رسکن بونڈ کے نام قابل ذکر ہیں۔

س: آپ کے خیال میں افسانہ نویسی مشکل ہے یا آسان؟

ج: افسانہ نگاری میرے خیال سے ایک مشکل فن ہے جسے اگر ایمانداری سے برتا جائے تو یہ بقول قاضی عبدالستار صاحب کے 'چاول پر قل ہو اللہ احد' لکھنے کا فن ہے۔ یعنی مختصر اور محدود پلاٹ میں بہت کچھ کہہ جانا اور اس طرح کہنا کہ موضوع کی ترسیل و ابلاغ میں کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو، دلچسپی بنی رہے اور فنی خوبیاں بھی موجود ہوں۔

س: آپ کے افسانوں کے کردار حقیقی ہیں یا تخیلاتی؟

ج: میرے افسانوں کے کردار بس حقیقی ہیں جن سے میں خود ملی ہوں یا جنھیں میں بخوبی جانتی ہوں۔ میں نے کبھی کوئی خیالی کردار تخلیق نہیں کیا۔

س: آپ اپنے افسانوں سے معاشرے کو کیا پیغام دینا چاہتی ہیں؟

ج: دیکھیے! افسانہ نگار نہ تو معلم اخلاق ہوتا ہے اور نہ ہی قوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی پیغام دے۔ افسانہ نگار کا کام ہوتا ہے، جس دور میں، جس سماج میں وہ سانس لے رہا ہے اس میں پیش آنے والے حالات، معاملات، واقعات اور مسائل جو اس کے ذہن کو متاثر کرتے ہیں، سماجی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں ان کو ہائی لائٹ کرے تا کہ لوگ ان کی اہمیت، افادیت کو سمجھیں اور اپنی زندگی اور سماج کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

س: ادبی رسائل میں سب سے زیادہ آپ کے افسانے کہاں سے شائع ہوئے یا ہوتے ہیں؟

ج: یوں تو میری کہانیاں پچھلے پینتالیس سالوں سے ملک کے بہت سے مشہور مقتدر ہر دل عزیز رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں اور آج بھی ہو رہی ہیں لیکن سب سے زیادہ کہانیاں شاید بیسویں صدی میں شائع ہوئی ہیں جس میں زمانہ طالب علمی سے ہی میں لکھتی چلی آ رہی ہوں۔

س: آپ کا شاہکار افسانہ کون سا ہے جسے فن افسانہ کا اعلیٰ نمونہ کہا جا سکے۔

ج: میں نے اپنا شاہکار ابھی لکھا ہی نہیں دیکھیے شاہکار ہم اپنی کسی بھی تخلیق کو نہیں کہہ سکتے ہمیں وہ کتنا ہی پسند کیوں نہ ہو۔ ہم اسے شاہکار اس لیے نہیں کہہ سکتے کیونکہ شاہکار کے بعد تو پھر فل اسٹاف آ جاتا ہے۔ جبکہ ہوتا کیا ہے کہ بہتر سے بہتر کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے تو ہم کسی بھی افسانہ کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہمارا شاہکار ہے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے بعد اگر کوئی میرے افسانوں کو پڑھے تو اس میں سے بہترین کو کہے کہ وہ ان کا شاہکار تھا۔ لیکن جب تک میں زندہ ہوں قلم میرا چل رہا ہے اس وقت تک ابھی میں نہیں کہہ سکتی کہ میں نے ابھی تک کوئی شاہکار تخلیق بھی کیا ہے۔

س: آپ نے معاصر اردو افسانہ نگاروں یا دوسری زبانوں کے افسانہ نگاروں سے بھی استفادہ کیا ہے؟

ج: جی ہاں! انگریزی میں او ہینری، رسکن بونڈ وغیرہ سے متاثر رہی ہوں۔

س: اردو افسانے کی تاریخ کے بارے میں کچھ بتائیں۔

ج: ہم سبھی اس امر سے واقف ہیں کہ اردو نثر کا ارتقا شاعری کے مقابلہ میں بہت دیر سے ہوا۔ ہمارا کلاسیکی ادبی سرمایہ محض چند داستانوں پر مشتمل ہے۔ انیسویں صدی میں انگریزی ادب کے اثر سے اردو میں ناول نگاری کی ابتدا ہوئی۔ ڈپٹی نذیر احمد، سرشار، مرزا ہادی رسوا کے اردو ناولوں کی بنیاد پڑی۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں منشی پریم چند نے افسانے لکھنے شروع کیے ان کے ابتدائی افسانے کافی طویل اور ناولٹ کہلائے جا سکتے تھے۔ پھر ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑی اور انگریزی ادب

Short Stories کو مختصر افسانوں کے طور پر متعارف کرایا گیا۔ منشی پریم چند کے علاوہ اس دور کے بہت سے بڑے بڑے فکشن نگاروں نے افسانہ نگاری کے فن کو بام عروج تک پہنچایا۔

س: آپ ہندوستانی سماج کے مسائل کو کس طرح دیکھتی ہیں؟ اور پھر انھیں اپنے افسانوں میں کس طرح بیان کرتی ہیں؟

ج: مزید یہ کہنا چاہوں گی کوئی بھی فنکار یا قلمکار عام لوگوں سے زیادہ حساس اور جذباتی ہوتا ہے اس لیے سماج میں پائے جانے والے انگنت چھوٹے بڑے مسائل جنھیں عام لوگ توجہ دیے بغیر گزر جاتے ہیں وہ قلمکار اور خصوصاً فکشن رائٹر کے دل و دماغ کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتا ہے لیکن فکشن رائٹر نہ تو صحافی ہوتا ہے اور نہ ہی رپورٹر کہ وہ اس مسئلہ کو جوں کا توں پیش کر دے بلکہ افسانہ نگار اس مسئلہ کو اور اس کی شدت کو اپنے اندر اتارتا ہے، محسوس کرتا ہے، جانچتا ہے، پرکھتا ہے تجزیاتی عمر سے گزرتا ہے اور پھر قدرے مختلف رنگ و روپ کے ساتھ اس کو افسانے میں ڈھالتا ہے۔ کوئی بھی سچا فنکار اپنے دور کے تقاضوں کو ان دیکھا نہیں کر سکتا لیکن اس کا ردعمل یا اظہار اس کی کیفیت سے گزر جانے کے بعد افسانے کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ جس کیفیت سے اس واقعہ کا حقیقی کردار گزر رہا ہو۔

س: عام طور پر افسانے کو فرضی کہانی تصور کیا جاتا ہے ایسا کیوں ہے؟

ج: میرا خیال ہے یہ مفروضہ ہے ایسا نہیں ہے افسانے کو فرضی کہانی کوئی ادب شناس شخص نہیں مانتا۔ اردو افسانے کا تو آغاز ہی حقیقتوں کو کہانی کی شکل میں پیش کرنے کی ضرورت اور کوشش سے ہوا پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

س: آپ اردو زبان کے کن ادبا سے زیادہ متاثر ہیں؟

ج: میں عصمت چغتائی، صبیحہ انور اور شمس الرحمٰن فاروقی سے متاثر ہوں۔

س: فن کے اعتبار سے کہانی مختصر قصے اور افسانہ و افسانچہ میں کیا فرق ہے؟

ج: کہانی تو کہانی ہوتی ہے چاہے وہ طویل ہو یا مختصر ہو یا مختصر ترین، جس کا مقصد انسانی زندگی کی کسی ایک جہد ایک واقعہ یا ایک یا دو کرداروں کے کسی ایک پہلو کا احاطہ کرنا ہوتا ہے۔ افسانچے کیونکہ مختصر ترین ہوتے ہیں اس میں ایمائیت، اشائیت اور علامتی انداز کا استعمال ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم افسانے کو ایک نظم مان لیں تو افسانچے کو غزل کا ایک شعر کہہ سکتے ہیں۔

س: آپ کے افسانے کن ادبی رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں؟

ج: میں ادب میں کسی خاص رجحان کی قائل نہیں ہوں اور غالباً مابعد جدیدیت میں لکھنے والے جتنے بھی لوگ ہیں وہ کسی خاص نظریے یا خاص رجحان سے جڑے ہوئے نہیں ہیں۔

س: کیا آپ شاعری بھی کرتی ہیں؟

ج: جی ہاں! شاعری بھی کرتی ہوں۔ ایک آدھ شعر یاد ہے، جو آپ کو سنا دیتی ہوں

عشق دو جہاں بھی ہے عشق لا مکاں بھی ہے
عشق ذات ہے میری عشق آگہی بھی ہے

س: اردو کی ترقی کے لیے آپ کیا کر رہی ہیں؟

ج: اردو کی ترقی کے لیے میں بساط بھر کوشش کرتی ہوں۔ میرا ایک کوچنگ سینٹر ہے جہاں میں گریجویٹ کی لڑکیوں کو پڑھاتی ہوں۔ زیادہ تر لڑکیاں ہندی یا انگریزی میڈیم کی ہوتی ہیں اور اردو سے واقفیت یا تو واجبی ہوتی ہے یا بالکل نہیں ہوتی۔ میری کوشش رہتی ہے کہ میں انھیں اردو لکھنا اور پڑھنا بھی سکھاؤں۔ ہاں ویسے میں مضمون اردو میں لکھنے کے لیے آمادہ بھی کرتی ہوں۔ اردو میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے میں انھیں اردو کے رسالے فراہم کرتی ہوں تاکہ وہ کہانیاں پڑھنے میں دلچسپی لیں اور اس بہانے اردو پڑھنا سیکھ لیں۔ اسی لیے میں نے ایک پرواز نامی ادبی نشست بھی شروع کی ہے جہاں میں لڑکیوں میں ادبی ذوق پیدا کر کے انھیں اردو میں کہانیاں اور نظمیں لکھنے کی ہمت افزائی کرتی ہوں اس بزم کی میٹنگ دو ماہ میں ایک بار ہوتی ہے جہاں میری طالبات اپنی اپنی ادبی تخلیق پڑھ کر سناتی ہیں۔ میں ان کی اصلاح کرتی ہوں اور ان کی تخلیقات کو پرواز نامی ایک میگزین میں شائع کر دیتی ہوں تاکہ ان کا حوصلہ بڑھے اور وہ اردو سے جڑی رہیں۔ یہ کوشش پچھلے تیس سال سے چل رہی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس میں مجھے کامیابی بھی ملی ہے میری کئی طالبات اب اردو کے اخباروں اور رسائل میں بھی چھپ رہی ہیں۔

□□□

Zaibun Nisa

A-1, 4th Floor

M.M. Apartment

Okhla Vihar, Jamia Nagar

New Delhi-110025

□□□

شخصیت

حدیثہ افضل

تعلیم نسواں کی علمبردار
رقیہ سخاوت حسین

بیگم رقیہ سخاوت حسین سرزمین بنگال کی اُس عظیم و نامور شخصیت کا نام ہے جنھوں نے خواتین کی تعلیم اور حقوق نسواں کی تحریک کو استحکام عطا کرنے میں اہم کردار نبھایا۔ 9ر ستمبر 1880 کو بیگم رقیہ کی پیدائش مشرقی بنگال کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور زمین دار گھرانے میں ہوئی۔ یوں کہیے کہ اس عہد کے تقاضوں سے سمجھوتہ کرتے ہوئے ان کے گھر میں بھی لڑکیوں کو تعلیم نہ دینے کا رواج تھا اور لڑکیوں کے لیے محض گھر میں رہ کر ہی عربی، فارسی اور قرآن واحادیث کی تعلیم حاصل کرنا کافی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن رقیہ بچپن سے ہی خداداد صلاحیت و ذہانت کا ملکہ رکھتی تھیں۔ اس لیے ان کے دو بھائیوں اور بڑی بہن کریم النساء نے ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے معاشرہ کی فرسودہ روایات سے انحراف کرتے ہوئے انھیں بنگلہ زبان میں تعلیم دینا شروع کیا۔ ایسے ماحول میں بہن بھائیوں کی سرپرستی میں تعلیم حاصل کرنا ان کے لیے کسی بڑی نعمت سے کم نہیں تھا۔

بیگم رقیہ نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہاں عورتوں کی تعلیم حاصل کرنے کو گناہ کبیرہ سمجھا جاتا تھا اور ایسی خواتین کو حقیر و ذلیل نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا جو دل سے تعلیم کی خواہاں تھیں۔ یہ وہی زمانہ تھا جب سرسید انگریز اور انگریزی سے متاثر ہوکر ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانان قوم کے مردوں کو عصری علوم حاصل کرنے کی طرف گامزن کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ بنگال میں خواتین کی تعلیم اور اُن کے حقوق کے حوالے سے گفتگو کی جائے تو رقیہ سخاوت حسین کا نام ایک روشن ستارے کی طرح نمودار ہوا۔ انھوں نے خاص طور سے مشرقی بنگال کی مسلم خواتین میں اپنی عملی کاوشوں سے تعلیم و تعلّم اور سماجی حقوق کے تئیں بیداری و خوداعتمادی کا جذبہ پیدا کیا۔ رقیہ بیگم کو اس بات کا خیال تھا کہ عورتوں کو تعلیمی وسماجی حقوق سے محروم رکھا گیا ہے اور نہ ہی کسی پر انھیں اقتدار حاصل تھا اس لیے وہ دل سے خواتین کی ہمدرد اور مساوات Equality کی قائل تھیں۔ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ تعلیم ہی وہ ایک واحد ہتھیار ہے جس سے سماج میں تبدیلی لالائی جاسکتی ہے۔

رقیہ بیگم ایک مسلم گھرانے کی چشم و چراغ تھیں اس لیے مذہبی تعلیم اور قرآن کی روشنی میں انھیں اس بات کا علم تھا کہ مذہب اسلام میں تعلیم

حاصل کرنا مرد اور عورت دونوں پر فرض ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر منصور عالم نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

''وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتی تھی اور جانتی تھی کہ اسلام میں تعلیم نسواں کی کیا اہمیت ہے اور اس کا مقصد ایک ایسی تعلیم ہے جو نسوانی زندگی اور نسوانی مقصدِ حیات سے ہم آہنگ ہو اور جو عورت کو ایک مثالی اور ہمدرد ماں، محبت کرنے والی بہو اور وفا شعار و فرمانبردار بیوی بنا دے جو مردوں کی محتاج نہ ہو۔''

(از منصور عالم کتاب مشمولہ مضمون: بنگال میں تعلیم اور حقوق نسواں کی علمبردار۔ رقیہ بیگم ص۔35)

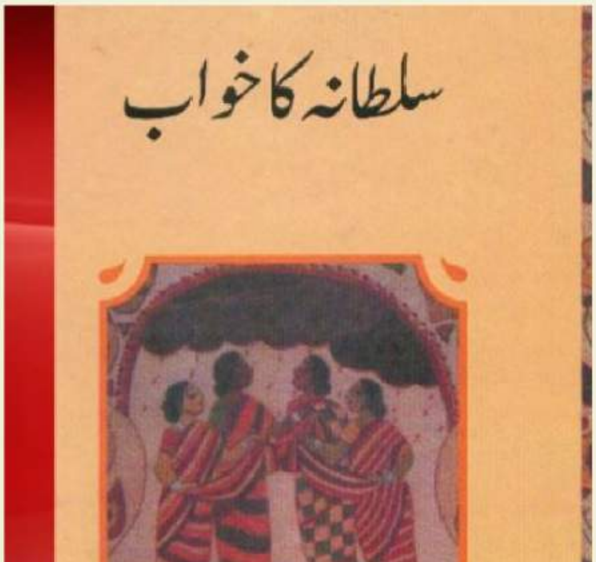

مسلم خاندان کی مذہبی روایت کے مطابق رقیہ بیگم کی شادی سخاوت حسین کے ساتھ کم عمری میں ہی کر دی گئی جو بھاگل پور ضلع میں ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ رقیہ بیگم سے سخاوت حسین کی یہ دوسری شادی تھی۔ اسے رقیہ بیگم کی خوش قسمتی کہئے کہ سخاوت حسین اعلیٰ تعلیم یافتہ اور آزاد و روشن خیال انسان تھے۔ان کو ابتدا سے ہی تعلیم نسواں میں دلچسپی تھی۔ اس سلسلے میں سخاوت حسین نے اپنی بیوی کو بھرپور تعاون دیا جو ان کے لیے کسی قیمتی اثاثہ سے کم نہیں تھا۔عورتوں کی تعلیم کے تئیں رقیہ بیگم کے جذبات کو دیکھتے ہوئے ان کے شوہر نے قدم قدم پر ان کی رہنمائی کی تا کہ ملک و قوم کی بچیاں پڑھ لکھ کر اپنے حقوق کے تحفظ کی پالیسی کو آگے بڑھائیں۔ نیز رقیہ سخاوت حسین نے اپنی انتھک محنتوں سے سماج کے نامساعد حالات کا دلیرانہ سامنا کیا اور بنگال کی مسلم خواتین کو کھلی آزاد فضا میں سانس لینے کی تلقین کی۔

انگریزی نظام تعلیم سے متاثر ہو کر جب ہندوستانی دانشوروں اور سماجی مصلحین (جس میں سرسید کا نام سرفہرست ہے) نے عصری علوم کی طرف ہندوستانیوں خاص طور سے مسلمان قوم کی توجہ مبذول کرائی تو انھیں علمائے قوم کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ حالانکہ سرسید سے تقریباً 50 سال قبل راجہ رام موہن رائے ہندوؤں کی تعلیم کے لیے کوشاں ہو چکے تھے لیکن موجودہ دور میں خواتین کی تعلیم کا مسئلہ دونوں اقوام کے لیے ایک بڑا چیلنج بن چکا تھا۔ اکثر سرسید پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ انھوں نے قوم کے مردوں کے تعلیم حاصل کرنے پر خصوصی زور دیا اور انھیں تعلیم نسواں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن ایسے دور میں جب مردوں کی تعلیم ہی مشکل تھی تو ایسے میں عورتوں کی تعلیم کا موضوع چھیڑ کر وہ خود کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ شاید یہی وجہ رہی ہو کہ بنگال کے کچھ مسلم رہنماؤں نے بھی تعلیم نسواں کی طرف خاص توجہ نہیں دی اور نہ ہی عملی طور پر کوئی قدم اٹھایا۔

بنگال کے ایسے ناخوشگوار حالات میں رقیہ سخاوت حسین کے لائحہ عمل سے خواتین کی تعلیم کے سلسلے میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ حالانکہ بہت سے سماجی ریفارمر جیسے راجہ رام موہن رائے، ایشور چند ودیا ساگر، دیانند سرسوتی اور کیشپ چندر سین وغیرہ کی ذاتی کوششوں سے تعلیم نسواں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور ان کی قیادت میں بہت سی سماجی تحریکوں کا جنم بھی ہوا۔ ایسے میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ رقیہ بیگم بھی کہیں نہ کہیں ان تحریکات سے متاثر ہوئیں۔

مسز سخاوت حسین اس حقیقت سے پوری طرح واقف تھیں کہ بنگال کے مسلم معاشرہ کی خواتین اپنی لاعلمی کے سبب سماج کے فرسودہ خیالات اور دقیانوسی رسم و رواج میں جکڑی ہوئی ہیں۔ ان کو اس پستی سے نکالنے کے لیے انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کا سہارا لیا، ان تقریروں اور تحریروں کا لہجہ مانوس ہوتا تھا۔ الفاظ عام و عوام سے ماخوذ ہوتے تھے تا کہ بات دل سے نکلے اور دل تک پہنچ جائے۔ بیگم رقیہ اپنے ایک مضمون ''صبح صادق'' میں تعلیم نسواں کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں:

''لڑکیوں کے لیے کم از کم ابتدائی تعلیم بے حد ضروری ہے۔

تعلیم کا مطلب محض چند کتابوں کو پڑھ لینا نہیں ہے۔ میں ایسی تعلیم چاہتی ہوں جو خواتین کو ان کے شہری حقوق سے واقف کرے، انھیں مثالی بیٹیاں بنانے کے ساتھ ایک نیک سیرت اور ذمہ دار زوجہ، ایک حساس اور شفیق ماں بننے کے اوصاف اجاگر کرے۔ ان کی ذہن سازی کے علاوہ جسمانی بناوٹ کو نکھارنے میں معاون رول نبھائے۔ ہم خواتین کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم اس دار فانی میں محض خوبصورت لباس زیب تن کرنے اور قیمتی زیورات سے خود کو آراستہ کرنے نہیں آئے ہیں، بلکہ چند اہم سماجی ذمہ داریاں بھی ہمیں نبھانی چاہئیں۔''

(بحوالہ مشمولہ مضمون ''بنگال میں تعلیم نسواں کی پہلی خاتون پیش رو: بیگم رقیہ از اصغر انیس کتاب بیگم رقیہ ایک عبقری شخصیت، ص۔ 77)

سخاوت میموریل اسکول بیگم رقیہ حسین کا وہ اہم کارنامہ ہے جس نے عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے ان کو مزید جلاء بخشی۔ جسے سرزمینِ بنگال کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ سخاوت حسین تعلیم نسواں کے زبردست حامی و علمبردار تھے اور جب انھیں اس بات کا علم ہوا کہ ان کی بیوی کے دل میں بھی علم کی شمع روشن ہے تو ان کے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے سخاوت حسین نے ہر طرح سے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ بدقسمتی سے کچھ ہی عرصے بعد سخاوت حسین مختصر علالت کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ شوہر کے انتقال کے بعد رقیہ کو بہت سے رنج والم سے گزرنا پڑا۔ رقیہ کی سوتیلی بیٹی اور اُس کے شوہر نے ان کے راستے میں کافی رکاوٹیں حائل کیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس بہادر خاتون نے خود کو سنبھالا اور بھاگل پور میں اپنے شوہر کی یاد میں ایک اسکول کا سنگ بنیاد رکھا۔ رقیہ کے شوہر سخاوت حسین نے انتقال سے قبل دس ہزار روپے کی رقم اسکول کی تعمیر کے لیے ان کو دے رکھی تھی۔ لیکن سوتیلی بیٹی اور اس کا شوہر ان کی جائیداد کو ہڑپنے کے لالچ میں تھے، اس لیے بیگم رقیہ یہ سب ظلم وستم زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکیں اور چند دنوں کے اندر بھاگل پور چھوڑ کر کلکتہ چلی آئیں۔ بیگم رقیہ نے اپنی زندگی میں دوسری بار کلکتہ آنے کا ارادہ کیا کیونکہ ان کے بہت سے رشتہ دار پہلے سے ہی کلکتہ میں مقیم تھے۔

کلکتہ میں رقیہ کی آمد سے تقریباً دو برس بعد بھاگل پور میں قائم سخاوت میموریل اسکول کو دوبارہ کھول لیا گیا۔ اسکول کے سلسلے میں رقیہ بیگم نے بہت سے دانش مند لوگوں سے صلاح ومشورے کیے۔ آخرکار 16/ مارچ 1911 کو 13 نمبر ولی اللہ لین میں سخاوت میموریل اسکول قائم کیا گیا۔ ابتدا میں یہاں محض آٹھ لڑکیوں نے داخلہ لیا۔ حالانکہ رقیہ کو یہاں بھی تعلیم نسواں کے فروغ کے سلسلے میں مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن رقیہ بیگم نے اپنے ہمت وحوصلہ سے گھر گھر جاکر تعلیم نسواں کی اہمیت وضرورت کو اجاگر کیا۔ لکھتی ہیں:

''لوگوں نے اس برقع پوش خاتون کی دل موہ لینے والی باتوں کو پسند کیا اور اپنی بچیوں کو اسکول بھیجنا شروع کیا۔ اسکول میں جب طالبات کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تو 1915 میں اسے یوروپین اسائلم لین (موجودہ عبدالحلیم لین) میں شفٹ کر دیا گیا جہاں اسکول ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ 1933 میں یہ اسکول لور سرکلر روڈ میں منتقل ہو گیا۔ 1938 میں ۱۷/ لارڈ سنہا روڈ اور پھر چند وجوہات کی بنا پر چند برسوں کے لیے علی پور ہیسٹنگز ہاؤس میں لے جایا گیا لیکن نواب مرشد آباد کی عطیہ کردہ زمین لارڈ سہنا روڈ میں مستقل طور پر شفٹ ہو گیا جہاں آج تک قائم و دائم ہے۔ حکومت مغربی بنگال کی وزارت تعلیم نے سخاوت میموریل اسکول کو پانچویں اور 1927 میں ساتویں جماعت تک منظوری دے دی۔''

(کتاب رقیہ بیگم ایک عبقری شخصیت مشمولہ مضمون: سخاوت میموریل اسکول۔ رقیہ بیگم کا ایک شاندار کارنامہ از نثار احمد ص۔ 71)

رقیہ سخاوت حسین کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اسکول کے نظم و نسق کو صحیح ڈھنگ سے چلانے اور بچیوں کے لیے تجربہ کار استانیاں مہیا کرانا تھا۔ ان سب کاموں کے لیے رقیہ نے دل وجان سے محنت کی اور ایک مکمل تعلیمی منصوبہ کے تحت بچیوں کی تعلیم کے حوالے سے ایک صاف ستھرا تصور پیش کیا۔ ساتھ ہی ساتھ طالبات کی خاص سہولیات کا بھی خیال رکھا۔ نیز آمد و رفت کے لیے گھوڑا گاڑی کا بھی بندوبست کیا جس میں پردے کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔ اس درس گاہ کے ذریعے رقیہ بیگم نے تعلیم نسواں کو اپنی زندگی سے جوڑے رکھا۔ لہٰذا اپنی گراں قدر خدمات سے مسز سخاوت نے فروغ تعلیم نسواں اور ترقی کے لیے راہیں ہموار کیں۔

رقیہ بیگم نے عصری تقاضوں اور طلبہ وطالبات کی ذہنی نشو ونما اور ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اسکول کے نصاب syllabus میں قرآن، اُردو فارسی، ابتدائی طبی امداد، کھانا پکانا، سلائی کڑھائی، فزیکل ایجوکیشن اور ووکیشنل کورسز جیسے موضوعات کو داخل کیا۔ اس کے علاوہ طالبات کو سائنس، لٹریچر، جغرافیہ اور تاریخی علوم سے واقف کرایا۔ ساتھ ہی یہاں لڑکیوں کو اخلاقی درس اور کردار سازی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ان

سب تعلیمات کا مقصد محض لڑکیوں کو خود کفیل بنانا، ان میں خودداری و خوداعتمادی جیسے جذبات کو اُجاگر کرنا تھا۔ آخر کار رقیہ بیگم کی محنت شاقہ اور ترقی کے تمام مراحل سے گزر کر سخاوت میموریل اسکول ہائر سیکنڈری لیول تک پہنچ گیا اور اسے سرکاری حیثیت بھی حاصل ہوگئی۔

> غرض رقیہ نے مسلم بچیوں کی تعلیم اور خواتین کی سماجی اصلاح اور ان کے تحفظ کی بقا کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ''انجمن خواتین اسلام'' نامی تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ اس تنظیم کے ذریعہ ان غریب اور نادار لڑکیوں کی شادیاں کرائیں جو شادی کے قابل ہوگئی تھیں۔ ''آل بنگال ویمن ایجوکیشن'' نامی ادارہ کی بھی سرگرم رکن بن گئیں۔ ایک اور ادارہ ''آل انڈیا مسلم ویمن سوسائٹی'' کی وہ روح رواں تھیں۔ ''ناری تیرتھ'' بھی ایک تنظیم تھی جس کے زیر اہتمام رقیہ نے طوائفوں کو گندگی کی دلدل سے نکال کر باعزت جینے کا حوصلہ بخشا۔۔۔ وہ اکثر کہا کرتی تھیں ''سماج کے کام کے لیے خود کو اتنا مضبوط کرنا ہوگا کہ کوئی بھی طوفانی ہوا ہمیں ہلا نہ سکے۔ ہمیں ہمارے عزم سے ہٹا نہ سکے۔''

(کتاب رقیہ بیگم ایک عبقری شخصیت مشمولہ مضمون: رقیہ ایک عہد ساز شخصیت از عذرا مناظ، ص94)

ایسے دور میں جہاں تعلیم نسواں کا کوئی واضح تصور نہیں تھا وہاں بنگال کی اس عظیم مسلمان خاتون نے سخاوت میموریل اسکول قائم کر کے اپنی عملی کاوشوں کا مظاہرہ کیا، وہیں خواتین کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے مسز سخاوت حسین نے اپنی تحریروں سے مسلمان عورتوں کو تعلیمی اور سماجی حقوق کے تئیں ذہنی طور پر بیدار کیا کیونکہ انھیں اس بات کا اندازہ تھا کہ خواتین کو جہالت اور لاعلمی کے سبب بہت سے سماجی حقوق سے محروم رکھا گیا ہے جس کی حقیقی معنوں میں وہ حقدار ہیں نیز رقیہ بیگم کی تحریریں ایک طرح سے عورتوں کے حق میں احتجاج کا ذریعہ ثابت ہوئیں۔

رقیہ بیگم کا ماننا تھا کہ مسلم معاشرہ میں پردے کی پابندی تعلیم نسواں کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ حالانکہ ان کے گھر میں بھی پردے کا معقول انتظام تھا اور شرعی طور پر انھوں نے بھی پردے میں رہ کر تعلیم حاصل کی۔ اس لیے رقیہ پردے کی مخالفت نہیں کرتیں بلکہ ان کا خیال تھا کہ پردہ ایسا ہونا چاہیے جو کسی بھی طرح سے حصول تعلیم میں رکاوٹ حائل نہ کر سکے۔

پردے کے علاوہ رقیہ بیگم کم سنی کی شادی، کثرت ازدواج، عورتوں کے جنسی استحصال اور ان کے حقوق کی پامالی پر بھی اپنی تحریروں میں بحث کرتی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے عورتوں کی جسمانی مشق پر بھی توجہ مرکوز کرائی کیونکہ عورتوں کا جسمانی لحاظ سے تندرست اور صحت مند رہنا ضروری ہے۔ ان سب کے لیے بیگم رقیہ نے خواتین کو ووکیشنل ٹریننگ کی سہولت بھی فراہم کی۔

بیگم رقیہ کا زیادہ تر تحریری سرمایہ بنگلہ زبان میں موجود ہے۔ ان کی مشہور ادبی تصانیف میں پیپاسا یعنی پیاس (اوّل تصنیف)، موتی چور، پدماراگ (ناول)، ابرودھ باسینی، استری جاتیر ابانتی وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ انگریزی زبان میں سلطانہ کا خواب (۱۹۰۵ء)، خدا دیتا ہے انسان لوٹتا ہے اور ایجوکیشن آئیڈیلس پر انڈین گرلس'' خاص ہیں۔ ان کی قائم کردہ سبھی تحریریں تعلیمی نظریات وافکار، روشن خیالی، حقیقت پسندی اور خواتین سے ہمدردی کے جذبہ کا ایک متاثر کن نمونہ ہیں۔

رقیہ کی سب سے مشہور تصنیف "Sultana's Dream" (سلطانہ کا خواب) ۱۹۰۵ء ہے۔ اسے رقیہ بیگم نے انگریزی زبان میں تحریر کیا، یہ ان دنوں کی بات ہے جب ان کے شوہر سخاوت حسین زندہ تھے۔ بیوی کی اس عظیم کارکردگی کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے اور اس کہانی کو اُس وقت کے مشہور رسالے ''انڈین لیڈیز'' میں چھپنے کے لیے بھیج دیا۔ اس کی اشاعت ادبی دنیا میں تہلکہ خیز ثابت ہوئی۔ دراصل اس طنزیہ کہانی میں ایک تخیلی دنیا آباد ہے۔ اس میں سلطانہ کے کردار کے ذریعہ ایک ایسی ریاست کا تصور پیش کیا گیا ہے جہاں خواتین کی دنیا آباد ہے اور مرد اپنے تمام اختیارات عورتوں کو سونپ دیتے ہیں۔ سلطانہ اس خواب میں کروڑوں خواتین کی بدحالی اور درد وکرب کو دور ہوتے ہوئے دیکھنے کی خواہش مند ہے۔ اس خیالی خوابی دنیا میں خواتین ہر قسم کے پیشہ ورانہ کاموں کو انجام دیتے ہوئے نظر آتی ہیں خواہ وہ تعلیم ہو یا سائنسی ایجادات یا امور خانہ داری۔ نیز اس ریاست میں خواتین امن کی قائل ہیں اور جنگ وفساد کو پسند نہیں کرتیں۔ اس کہانی میں رقیہ کے تعلیمی افکار کے حوالے سے بنگلہ دیش کی ایک مشہور ادیبہ روشن جہاں یوں رقم طراز ہیں:

> ''سلطانہ کا خواب، خواب کے طور پر بیان کیا گیا ہے لیکن اس میں ایک منطقی تعلق موجود ہے۔ غیر معمولی چیزوں کا ہونا ممکن نہیں مگر جادو یا مافوق الفطری طریقوں سے نہیں۔ ان سب کو ترقی یافتہ ٹکنالوجی کی اصطلاحوں میں بیان کیا گیا ہے۔ ٹیکنالوجی انسان کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ یہاں پھر

ہندوستانی مزاج نظر آتا ہے۔عورتوں کی مملکت میں وہ تمام سہولتیں ہیں جو رقیہ کی سرزمین میں نہیں۔ اس کہانی کے افلاطونی عنصر کی تحسین اور مصنف کا اعتبار کہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے یہ مسائل حل ہوسکتے ہیں،غور کے قابل باتیں ہیں۔''

(بحوالہ مشمولہ مضمون: سخاوت میموریل اسکول: رقیہ بیگم کا ایک شاندار کارنامہ، از نثار احمد ص۔73)

اس کہانی کے ذریعے بیگم رقیہ طبقۂ خواتین کو بیدار اور متحرک کرنا چاہتی تھیں اور یہاں مرد معاشرہ سے ان کا سوال تھا کہ خواتین ملک کے ترقیاتی کاموں میں کوئی اہم رول ادانہیں کرسکتیں؟ دراصل اس کہانی کو تحریر کرنے کے پیچھے ان کا یہ مقصد پوشیدہ تھا کہ ہر میدان میں خواتین مردوں سے آگے بڑھ کر سوسائٹی میں اپنا ایک اہم مقام حاصل کریں۔

لہٰذا رقیہ سخاوت حسین نے اپنی انتھک کوششوں سے بنگال میں تعلیم نسواں کا چراغ روشن کیا۔ ایک سماجی کارکن ہونے کے علاوہ وہ ایک اچھی ادیبہ بھی تھیں جنھیں بنگلہ اور بعد میں انگریزی زبان میں مہارت حاصل ہوئی۔ رقیہ بیگم ایک حوصلہ مند خاتون تھیں جنھوں نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کے بل پر موجودہ سماج میں عورتوں کی تعلیم کے لیے راہیں ہموار کیں۔ رقیہ بیگم نے مسلم معاشرے کی خواتین پر ہونے والے ظلم وستم کا انتہائی گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کیا تھا اس لیے اپنی تحریروں کے ذریعے انھوں نے عورتوں کوخواب غفلت سے بیدار کیا اوراُن میں شعور کا جذبہ پیدا کیا۔

❑❑❑

Hadisa Afzal
H.No. 3311 Farhatullah Street
Kucha Pandit, Lal Kuan
Delhi-110006

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر........................ بتاریخ........................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC: SYNB0009009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

شاعرات کے منتخب اشعار

لگی ہیں شعلہ بیانی کی تہمتیں اکثر
ہم ان کے شہر میں ہر چند بے زبان رہے

کس سے شکوہ کریں ویرانی ہستی کا حیات
ہم نے خود اپنی تمناؤں کو جینے نہ دیا

مسعودہ حیات

ماضی کو بھول آئے ہم صورت حال کے سبب
چہرہ غبار ہو گیا گردِ ملال کے سبب

ایک منظر پر نظر ٹھہرے تو ٹھہرے کس طرح
ہم مزاج گردش ایام کے کر آئے ہیں

سیدہ شان معراج

اک تلاش آب میں کتنے سرابوں سے ملے
قریہ قریہ کو بہ کو ہم تشنہ لب گھوما کیے

کیا جانے کس تلاش میں صدیاں گزر گئیں
بے نام منزلوں کا پتہ پوچھتے رہے

صدیقہ شبنم

جواب دوں ترے لہجے میں دل یہ کہتا ہے
میں چپ رہوں یہ تقاضہ مرے وقار کا ہے

مجھے خبر تھی ترے تیر میری تاک میں ہیں
سو اب اڑان میں میرا کہیں قیام نہیں

نسیم سید

وہ سب کچھ دیکھ لے گا روز محشر
مگر میں روز محشر دیکھتی ہوں

بسے گھر میں اجڑتے دل بھی دیکھے
سو دل میں گھر بسا کر دیکھتی ہوں

سکینہ ساجد پنہاں

یہ بھی اک حادثہ گزرا ہے خزاں کے ہاتھوں
پیڑ کا جسم ہے سائے کی ردا سے باہر

اب یہ تعلق ریت ہوا تو اتنی حمیرا حیرت کیا
رشتوں کی بنیاد اٹھی تھی کچھ ہموار دراڑوں میں

حمیرا رحمٰن

سمٹے ہوئے پروں کو کسی دن میں کھول کے
اڑ جاؤں گی فضاؤں کے تیور ٹٹول کے

جی چاہتا ہے اک نئے انداز سے جیوں
ہستی کی تہہ بہ تہہ سبھی پرتوں کو کھول کے

شہناز نبی

دور تک ساحل پہ دل کے آبلوں کا عکس تھا
کشتیاں شعلوں کی دریا موم کے بہتے رہے

مٹ گئی ریت کی صورت جو تھی خواہش اپنی
ریگ زاروں پہ بنائی تھی رہائش اپنی

عفت زریں

ڈاکٹر معین الدین شاہین

کلام سرورِ جہان آبادی میں تذکرۂ خواتین

منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی کا شمار ہمہ جہت شاعروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے متعدد شعری اصناف کے حوالے سے پُر تاثیر انداز میں اپنے قلبی احساسات و جذبات کا اظہار کر کے اردو کے دامن کو وسیع کرنے کی کوشش کی، جس کے ثبوت میں اُن کی وہ تمام شعری تخلیقات پیش کی جاسکتی ہیں جو اُن کے مختلف شعری مجموعوں اور انتخابات میں شامل ہیں۔ سرور کا مرتبہ اس لیے بھی بلند ہے کہ انھوں نے میدانِ شاعری میں غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، نوحہ، رباعی اور قطعہ وغیرہ کی صورت میں جو ادب تخلیق کیا اُس میں انفرادیت موجود ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انھیں بہ حیثیت نظم نگار زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اُن کی رومانی، عشقیہ، فطری، قومی و وطنی اور اصلاحی نظمیں بلا کی تاثیر رکھتی ہیں۔

سرور کو ہندوستانی تہذیب، تمدن، ثقافت اور اخلاقی روایت پر فخر تھا۔ انھوں نے خواتین کو ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ اکثر اُن کی نظموں کا مطالعہ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں ''ماتر شکتی'' سے گہری عقیدت ہے، اسی لیے انھوں نے خواتین سے متعلق بعض ایسی لاجواب اور بے مثال منظومات تخلیق کیں جو خواتین سے متعلق ادب، احترام اور عقیدت جیسے جذبات سے سرشار ہیں۔ گو کہ اس قبیل کی منظومات سبھی مجموعوں اور انتخابات میں موجود ہیں لیکن ''نوائے سرور'' میں مذکورہ جذبات و موضوعات کی فراوانی ہے۔ اس مجموعۂ کلام کی چند مشہور مقبول منظومات میں ''نور جہاں کے مزار پر''، ''زن خوش خو''، ''ایک حسینہ اور جگنو''، ''پدمنی''، ''سیتا جی کی گریہ وزاری''، ''روٹھی رانی''، ''اُجڑی ہوئی دلہن''، ''لکشمی جی''، ''ستی'' اور ''صدائے شرم'' جیسی منظومات شامل ہیں جن کے مطالعے و مشاہدے سے یہ رمز فاش ہوتا ہے کہ خواتین سے متعلق ان سے قبل اور اُن کے معاصر شعراء نے اس طرف ویسی توجہ صرف نہیں کی جیسی مثال سرور نے پیش کی۔ سرور نے اپنی متذکرہ منظومات میں ہندوستان کی آدرش ناری یعنی مثالی خواتین کا جو روپ پیش کیا اُس سے متاثر ہو کر پروفیسر حکم چند نیر رقم طراز ہیں :

> ''سرور کو عورتوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے پر پوری قدرت حاصل تھی۔ اُن کا مشاہدہ اور نفسیاتی مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اُن کے یہاں عورت کے جذبات اور احساسات کی دل نواز تصویریں اور گوناگوں تفسیریں ملتی ہیں۔ اُن کے یہاں عورت روایتی تصورات کے تحت صرف جنسی خواہشات کا مجسمہ یا ایک مقدس دیوی بن کر سامنے نہیں آتی۔ وہ ایک ماں، ایک بیوی، ایک مظلومہ اور ستم رسیدہ اور سب سے بڑھ کر ایک عورت کے روپ میں سامنے آتی ہے۔''

اسی طرح اپنے دور کے مشہور شاعر نوبت رائے نظر نے کلامِ سرور میں خواتین سے متعلق تصورات و تفکرات کی نشان دہی کرتے ہوئے

لکھا ہے کہ:

''عورتوں کے جذبات اور اُن کے فطری اوصاف پر سرور نے نہایت غائر نظر ڈالی ہے اور اس صنف خاص میں انھیں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ''پدنی''، ''دمن اور نہس''، ''سیتا جی کی گریہ وزاری''، ''زنِ خوش خو''، ''ادائے شرم'' وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ اصلاح معاشرت کے متعلق اگر چہ انھوں نے بہت کم کہا ہے تاہم بیوگی کی رسم سے خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں اور ''سوزِ بیوگی'' کے عنوان سے ایک درد بھری نظم اس مجموعہ میں موجود ہے۔''

پروفیسر نیّر کے مذکورہ بیانات کی وضاحت میں سرور کی نمائند تخلیقات سے اگر چہ متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن یہاں ایک بہترین مثال پر اکتفا کیا جارہا ہے، یعنی :

تیرا دیواستھان دیوی دل کے کاشانے میں ہے
تیری تصویرِ مقدّس ہر صنم خانے میں ہے
لکشمی تو ہے زمانے میں اُجالا تیرا
ہر کنول کا پھول پانی میں شوالہ ہے تیرا
سرسوتی کا روپ ہے، دُرگا کی ہے اوتار تو
نطق ودانش کی ہے دیوی مادرِ غمخوار تو
اف یہ سندر چھب تیری، یہ سانوری صورت تیری
دل کے مندر کی ہے زینت موہنی مورت تیری

یہ اشعار نظم ''مادرِ ہند'' سے ماخوذ ہیں۔

اس کے علاوہ سرور جب اپنی نظم بعنوان ''گنگا'' میں گنگا ندی کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ صنفِ نازک کی شان میں قصیدہ پڑھ رہے ہوں، دراصل یہ رومانی انداز کسی عورت کے حسن و جمال اور رعنائی وزیبائی کی مثال معلوم ہوتا ہے :

اُو پاک باز نازنین، اُو پھولوں کے گہنے والی
اُو عفتِ مجسم پربت کی رہنے والی
صلِ علیٰ یہ تیری موجوں کا گنگنانا
وحدت کا یہ ترانہ، او چپ نہ رہنے والے
حسنِ غیور تیرا ہے بے نیازِ ہستی
تو بحرِ معرفت ہے، اُو پاک باز ہستی

کہا جاتا ہے کہ سرور وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے محبوب کو عورت کے روپ میں پیش کیا ہے ورنہ فارسی کی تقلیدی اور روایتی شاعری سے متاثر شعرائے اردو نے اپنے محبوب کو مرد کی صورت میں تصور کر کے مخاطب کیا ہے۔ لیکن سرور نے اس تقلید و روایت سے انحراف کرتے ہوئے عورت کو عورت کی صورت ہی میں پیش کیا۔ اِس بابت پروفیسر حکم چند نیّر کا یہ بیان بے حد متوازن اور برمحل معلوم ہوتا ہے کہ :

''سرور نے حسن اور لوازماتِ حسن کا بھرپور مشاہدہ کیا ہے اور عورت کے جسم و جمال، رنگ و روپ اور آرائش وزیبائش کو جس طرح دیکھا ہے، بے کم وکاست تصویر میں پیش کر دیا ہے، یہ عورت ہندوستان میں پیدا ہوئی ہے، یہیں پلی اور بڑھی ہے، اس کے لوازماتِ حسن میں چوڑیاں ہیں، نورتن ہیں، مانگ کی افشاں ہے جو تاروں بھری انجمن کا سماں دکھاتی ہے۔ مشرقی عورت شرم وحیا سے آراستہ ہے۔ یہ خلوص وصداقت اور ایثار وقربانی کا پتلا ہے اور یقیناً بے باک عشوہ طراز اور اوباش جامن والیوں، مالنوں، مہترانیوں اور جنگل کی شہزادیوں سے افضل ہے۔ یہ حسن و جمال لطافت وجوانی کا مجسمہ ہے جس کے آگے فرشتے بھی سربسجود ہوجاتے ہیں۔ مادّی حسن کی جس قدر مکمل تصویریں سرور نے پیش کی ہیں، کسی نے آج تک نہیں پیش کیں۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنے مضمون بعنوان ''درگا سہائے سرور اور عروسِ حبِّ وطن'' میں کلامِ سرور میں صنفِ نازک سے متعلق سرگرمِ عمل موضوعات وتخیلات پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں :

''عورت کے حسن کے کئی روپ ہیں۔ قدیم آریائی ذہن نے عورت کی مختلف شاخوں یعنی بیوی، بیٹی، بہن، ماں، محبوب وغیرہ پر بیک وقت بھی نظر ڈالی ہے۔ اور جنس کے تصور کی طرح طرح سے تقدیس اور تطہیر بھی کی ہے۔ دورِ حاضر میں فراق گورکھپوری کے ہاں عورت کے اس جامع تصور کی کارفرمائی ہے۔ فراق نے اس تصور کو اپنانے کی شعوری کوشش کی ہے۔ جبکہ سرور کے ہاں وطن کے ہمہ پہلو جسمانی تصور کا سوتا ان کی ذاتی محرومی اور نارسائی کے احساس سے پھوٹتا ہے اور غیر شعوری طور پر جنس کی جمال آفرینی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اُن کی نظم عروس حب وطن کے یہ اشعار دیکھیے۔ ان میں کسی مست شباب دوشیزہ سے شبِ وصال منانے، اس کو گلے لگانے اور اس کی زلف مشک بو سے کھیلنے کی کیسی کیسی تمنائیں مچل رہی ہیں۔ نظم کا اندازِ بیان وہی

محبوب سے خطاب کا ہے جو سرور کو سب سے زیادہ مرغوب تھا۔

آ اے نگار تجھ کو گلے سے لگاؤں میں
آ، مجھ سے ہمکنار ہوا لے شوخ خوش گلو
وہ دن خدا کرے کہ مناؤں شبِ وصال
گردن ہو تیری اور مرا دستِ آرزو
زانو ہو تیرا اور سر شوریدہ ہو مرا
میرا مشامِ جاں ہو تری زلفِ مشکبو
تیری شرابِ عشق کا آنکھوں میں ہو سرور
خلوت میں ہو نہ ذکر مے و شیشہ و سبو
لپٹوں میں بیخودی میں جو تجھ سے شب وصال
بانہیں ترے گلے میں ہوں لب پر یہ گفتگو

اردو شاعری میں سراپا نگاری کی متعدد مثالیں مل جاتی ہیں، لیکن سرور جیسا دلکش انداز انوکھے پن کی بہترین نظیر مشکل ہی سے ملتی ہے۔ سرور جب کسی فطری منظر کا ذکر کرتے ہیں تو وہاں بھی صنفِ نازک کسی نہ کسی روپ میں جلوہ نما ہوتی ہے، جیسے :

وہ فتحِ آب، وہ موجیں، وہ جوشِ طغیانی
وہ آبشار، وہ جھرنے، وہ خوش نما پانی
وہ آفتاب کی کرنوں کی جلوہ افشانی
وہ طائرانِ گلشان کی زمزمہ خوانی
پری وشوں کا وہ پنگھٹ پہ جوق جوق آنا
سُبو و دوش پہ، پانی کو بھر کے لے جانا

گھونگھٹ اُلٹ اُلٹ کے رخ نازنیں سے تو
کرتی ہے چھیڑ سلسلۂ عنبریں سے تو
ہونے کو ہمکنار گل و یاسمیں سے تو
چلتی ہے برقِ عطر خلدِ بریں سے تو
یوں دھیرے دھیرے آتی ہے تاروں کی چھاؤں میں
مہندی لگا کے جیسے چلے کوئی گاؤں میں

''سیتاجی کی گریہ وزاری'' سرور کی شاہکار نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے ہندوستان کی مثالی خاتون یعنی آدرش ناری کا روپ دکھایا ہے۔ اس نظم کا ایک ایک شعر تاثیر میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً :

ہمراہ اپنے ساتھ مجھے ناتھ لے چلو
ریکھا تمھارے قدموں کی ہوں ساتھ لے چلو
نازک ہے میرا شیشۂ دل ٹوٹ جائے گا
چھوٹا تمھارا ساتھ تو جی چھوٹ جائے گا
قسمت نے جب سے باپ کے گھر سے جدا کیا
سوامی مجھے نہ تم نے نظر سے جدا کیا
گھر میں جو چھوڑ جاؤ گے سیتا غریب کو
پاؤ گے ون سے آکے نہ جیتا غریب کو
شوہر بغیر قابلِ بیجا ہے آہ زن
شمع خموش خانۂ ویراں ہے آہ زن
کرپا ودھان مجھ کو نہ دو دکھ وِیوگ کا
پرانوں کے پران مجھ کو نہ دو دکھ وِیوگ کا

اسی طرح ہندوستانی آدرش ناری کا ایک اور روپ ان کی مشہور نظم ''سوزِ بیوگی''، میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے، یعنی :

عجب رقت بھری اے چارہ گر ہے داستاں میری
جگر میں چٹکیاں لیتی ہے رہ رہ کر فُغاں میری
پسند آئی نہ آرائش تجھے او آسماں میری
اتاری بندیاں بے درد توڑی چوڑیاں میری
فلک نے چھین لیں مجھ سے شہابی چُنریاں میری
پہنتی سرخ جوڑا ایسی قسمت تھی کہاں میری
بہا جاتا ہے دل آنکھوں سے خونِ آرزو ہوکر
یہ رونا ہے رہے گی بیکسی یارب کہاں میری

''نور جہاں کا مزار'' سرور کی طویل نظموں میں شامل ہے۔ گوکہ یہ نظم 144 اشعار پر مشتمل ہے لیکن وحدتِ تاثر میں کسی طرح کا خلا یا تعطل محسوس نہیں ہوتا۔ زبان وبیان اور عمدہ تشبیہات واستعارات نے اس نظم کو جو تاثیر بخشی اُس کے پیشِ نظر سرور کی شہرت میں اضافہ ہوا۔ واضح ہو کہ یہ نظم سرور نے ایسے وقت لکھی تھی جب علامہ اقبال جیسے عظیم شاعر کا ڈنکا بج رہا تھا، چنانچہ علامہ کا کوئی معاصر اس قسم کی تخلیق کو پایۂ تکمیل پر پہنچائے یہ بھی ایک قسم کا اعزاز ہے۔ اس نظم سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں :

نور بن بن کر برستی ہے در و دیوار سے
کس کے جلوے کی تجلی، کس کے پرتو کی ضیا
کس کا شانہ صبح کو اٹھ کر ہلاتی ہے نسیم
گدگداتی ہے کسے آہستہ آہستہ صبا

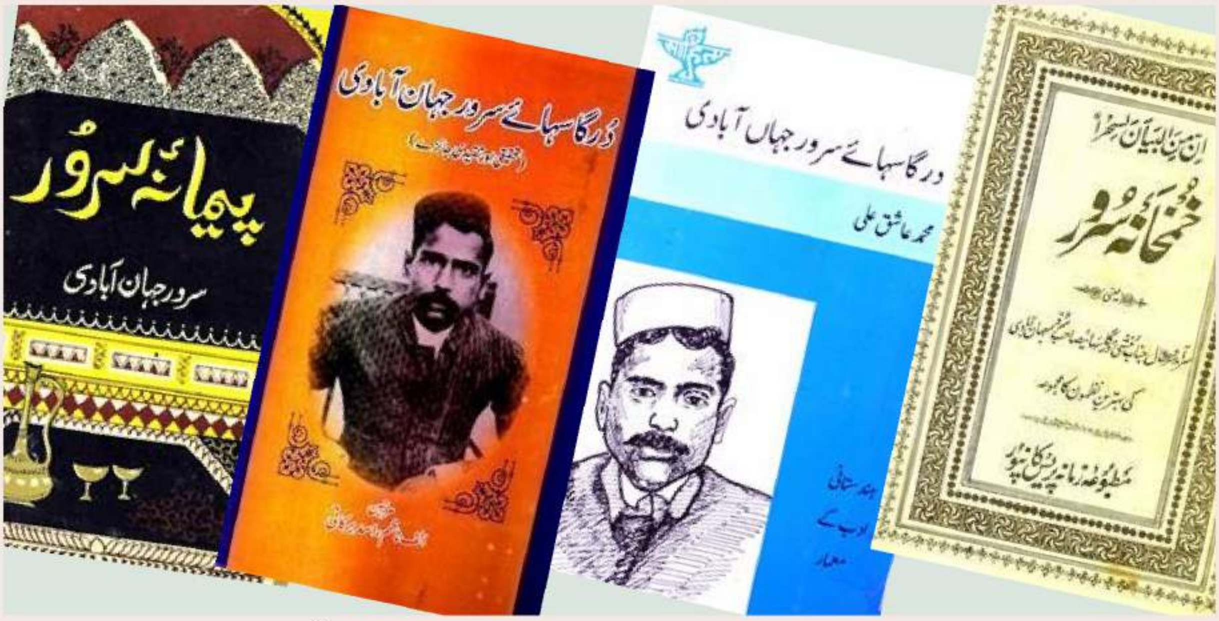

سو رہی ہے کون، رکھ کر بالشِ سیمیں پہ سر
محوِ خوابِ ناز ہے یہ کس کی چشمِ نیم وا
پڑ گئی کس نازنیں کے حسن کے پھولوں پر اوس
کس پری تمثال کا بوٹا سا قد کمہلا گیا
کس کے غم میں بھر رہی ہے ٹھنڈی سانسیں بادِ سرد
کس کا شیون کر رہے ہیں آہ مرغانِ ہوا
کس پری وش نازنیں کا عنبر افشاں ہے کفن
بھینی بھینی کس کے بالوں کی مہک سے ہے ہوا

''پدمنی'' ایک ایسا تاریخی کردار ہے جس پر قریب قریب ہر زبان میں شعری تخلیقات وجود میں آتی رہی ہیں۔ ہر شاعر کے سوچنے کا ڈھنگ اور طریقہ الگ الگ ہے۔ سرور نے بھی پدمنی کے کردار کے تقدس کے پیش نظر اپنے طور پر انفرادی رنگ و آہنگ کے ساتھ نظم تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے اکثر ناقدین نے اس نظم کی بھی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ دراصل یہ نظم ہے ہی ایسی کہ کوئی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ذیل میں اس نظم کے چند اشعار پیش خدمت ہیں :

تیری فطرت میں مروّت بھی تھی غمخواری بھی
تیری صورت میں ادا بھی تھی طرحداری بھی
جلوۂ حسن میں شامل تھی نکو کاری بھی
درد آیا تیرے حصے میں ، تو خود داری بھی
آگ پر بھی نہ تجھے آہ مچلتے دیکھا
تپشِ حسن کو پہلو نہ بدلتے دیکھا

تو وہ عصمت کی تھی او آئینہ سیما تصویر
حسنِ سیرت سے تھی تیری متجلّا تصویر
لاکھ تصویروں سے تھی اک تری زیبا تصویر
تجھ کو قدرت نے بنایا تھا سراپا تصویر
نور ہی نور تیرے جلوۂ مستور میں تھا
انجمِ ناز کا جھرمٹ رخِ پُر نور میں تھا

یہ بھی ایک زندہ حقیقت ہے کہ اپنی مرحومہ بیوی کی یاد میں حد درجہ مئے نوشی کرنے اور نہایت تنگ دستی اور عسرت کی زندگی گذارنے والے سرور جہان آبادی نے اپنے دماغی توازن کو برقرار رکھ کر سرگرمِ عمل شاعر کی حیثیت سے خواتین کے متعلق تاریخی نوعیت کی ایسی منظومات تخلیق کیں جو ادبی لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ گو کہ ان کے مجموعہ ہائے کلام ''جامِ سرور''، ''خمخانۂ سرور'' اور ''خمکدۂ سرور'' میں اس قبیل کی نظمیں موجود ہیں لیکن پروفیسر حکم چند نیّر نے سرور کا مجموعہ ''نوائے سرور'' مرتب کر کے شائع کرایا تو ایسی تمام منظومات کو ترجیح دی۔ دراصل یہ اور اسی نوعیت کی منظومات سرور شناسی میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔

□□□

Dr. Moinuddin Shaheen
Associate Professor
395-A, Azad Nagar Kotra,
Pushkar Road
Ajmer-305001 (Rajasthan)

ڈاکٹر ریاض احمد

ہندوستان میں خواتین کی تعلیم

تاریخی تناظر اور جدید چیلنجز

برصغیر ہند کی تاریخ جتنی قدیم ہے پڑھنے لکھنے کا رواج بھی اسی قدر قدیم ہے۔ ہندوستان کی تقریباً پانچ ہزار سالہ تاریخ میں شکشا دکشا کی روایت شروع سے ہی ملتی ہے۔ تاہم تعلیم وتربیت کا زیادہ تر تعلق لڑکوں اور مردوں سے ہی رہا ہے۔ ہاں مگر کئی ادوار میں کچھ عورتوں نے اپنی ذاتی کوشش کی بنا پر تعلیم وتربیت کے میدان میں اپنا علم بلند کیا۔ ویدک دور سے ہی منظم تعلیمی سسٹم کا پختہ ثبوت ملتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ان تمام تعلیمی اداروں کے قائم کرنے کا مقصد بالخصوص لڑکوں اور مردوں کی تعلیم و تربیت ہی تھا۔ قدیم ہندوستان کے ورن سسٹم (Varana System) میں تعلیم وتعلم کا محور برہمن ہی تھے۔ حالانکہ ویدک عہد میں تعلیم یافتہ عورتوں کا ثبوت ملتا ہے لیکن لڑکوں کی طرح لڑکیوں اور عورتوں کو گروکل (Gurukula) میں شامل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ بعض گھرانوں میں ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام گھر پر ہی ہوتا تھا۔ ان کی تعلیم کا محور اور مقصد امور خانہ داری، بچوں کی پرورش و پرداخت اور گھریلو دست کاری وغیرہ تک محدود تھا۔ تاہم چند عورتوں کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ انھیں ادب اور ویدوں پر تبصرہ کرنے کی اہلیت حاصل تھی۔ ویدک اور برہمن عہد کے بعد بودھ عہد میں جو برہمن واد کی مخالفت میں تھی اور چھوا چھوت، سماجی بھید بھاؤ، اعلی ادنی میں امتیازی سلوک، رسوم وقیود اور تنگ نظری سے اوپر اٹھ کر قائم کیا گیا تھا، یہاں لڑکیوں اور عورتوں کی باضابطہ تعلیم حاصل کرنے کا پختہ ثبوت ملتا ہے۔ بودھ مذہب کے مختلف تعلیم گاہوں مثلاً تکشیلا، نالندہ، ولبھی، وکرم شیلا وغیرہ جیسی درسگاہوں میں عورتوں کو شامل ہونے کی اجازت مل گئی۔ ان کو بھی بودھ سنگھوں میں شامل ہونے اور ان کے ضابطہ اخلاق کی پیروی کرنے کا حق حاصل ہوگیا۔ ان مٹھوں میں خواتین کے لیے الگ سے تعلیمی انتظام کا پختہ ثبوت ملتا ہے۔ بودھ عہد میں کچھ مٹھوں کی تعمیر وتشکیل صرف تعلیم نسواں کے لیے ہی کی گئی۔ تاہم اس دور میں بھی باوجود تعلیم کے حق حاصل ہونے کے خواتین کی عمومی تعلیم نہ ہوسکی۔ ہاں مگر کچھ خواتین نے اپنی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے مردوں کے شانہ بشانہ بودھ مذہب کی تبلیغ کی جن میں Pravavti Gupt Rani, Nayanika Rani, Prabhudevi, Vijayanaka, Sheelbhatta اور سنت مترا جو اشوک اعظم کی بہن تھی کے نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں۔

پورے بودھ عہد میں چوتھی صدی عیسوی سے آٹھویں صدی تک کے پانچ سو سال کا دور ہندوستانی تاریخ میں تعلیم کا عظیم دور کہا جاسکتا ہے۔ بالخصوص گپتا اور ہرش وردھن کے خاندانوں کا زمانہ جو ہندوستان میں تعلیمی توسیع کے لیے نہایت موزوں تھا۔

ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کی آمد سے پہلے ہی ولیوں اور صوفیوں کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کا پرچار ہونے لگا تھا۔ دلی سلطنت

(1206-1526) کے پورے عہد میں مدارس کے پھیلاؤ کا تاریخی ثبوت موجود ہے۔ ایک منظم ہندوستانی تعلیمی ڈھانچہ کے ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کے تعلیمی نظام کا پھیلاؤ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ اس نئے تعلیمی نظام میں ہندوستان کے قدیم تعلیمی نظام کے مقابلے زیادہ عوامی اور کھلا پن تھا۔ لیکن مغل دور سے قبل لڑکیوں یا خواتین کی تعلیم کا علیحدہ اور مخصوص انتظام نہیں تھا۔ ہاں مگر مغل عہد میں لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ کے ثبوت ملتے ہیں لیکن لڑکوں اور مردوں کے تعلیمی اداروں کے مقابلے ان اداروں کی تعداد نہایت کم تھی جن میں لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم کا خصوصی انتظام تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد حکومت میں عورتوں کی تعلیم کے متعلق ایس۔ایم۔جعفر نے اپنی کتاب ''تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں'' میں لکھا ہے:

> ''ہندوستان میں مسلم خواتین اس درجہ کمال کو پہنچ سکیں جو اسلام کے عوائل عہد میں ان کی پیش رو پہنچ چکی تھیں۔ تاہم اگر ہم ان کے زمانہ کے اور ان حالات کا خیال نظر انداز کر دیں تو پھر یہ اندازہ کرنا صحیح ہوگا کہ انھوں نے علمی اعتبار سے کتنی ترقی کی، اور پھر یہ سمجھنا بالکل غلط ہوگا کہ ان کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے علاحدہ مدرسے ہوتے تھے لیکن عموماً ان کی تعلیم یا تو خود ان کے گھروں پر ہوتی یا استادوں کے گھروں پر جو قریب ہی رہتے۔ بعض وقت بڑی عمر کے علما بھی جن کا تقوی مسلم ہوتا پڑھی لکھی لائق خواتین اور معلمات اس کام کے لیے مقرر کی جاتیں''۔

(ایس۔ایم جعفر، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، (مترجم سعید انصاری) ، این سی پی یو ایل، دوسرا اڈیشن۔ 2001، صفحہ 14-13)

1857 کی ناکام جنگ آزادی عہد وسطی اور دور جدید کے درمیان حد فاصل ہے۔ گو کہ ہندوستان پر برطانیہ کی بلواسطہ حکومت پہلے سے ہی تھی لیکن اس جنگ کے بعد برطانیہ کی بلاواسطہ عہد حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔ 1857 کے بعد ہندوستانی سیاست میں بہت حد تک تبدیلی آئی لیکن تعلیم کی نہج پر کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اب بھی شہروں اور گاؤں، انگریزوں اور ہندوستانیوں، غریبوں اور امیروں اور لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان تعلیم کا تناسب ویسا ہی تھا۔ سماجی اور تعلیمی سطح پر اصلاحی تحریکوں سے ہندوستانیوں کے انداز فکر میں تبدیلی ضرور آئی۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں دیسی تعلیمی نظام سے متعلق اور خواندگی سے متعلق اعداد و شمار تقریباً ناپید ہیں۔ ہاں مگر اس عہد میں برطانوی راج کے تحت آنے والے کچھ علاقوں کے دیسی اور انگریزی تعلیم کے اعداد و شمار ملتے ہیں مثلاً سر تھامس کے حکم سے 1822 کی دیسی تعلیم سے متعلق انکوائری، ماؤنٹ اسٹارٹ الفنسٹن کے ذریعہ ممبئی پریسی ڈنسی اور لارڈ ولیم بینٹک (1835-38) کے حکم سے بنگال کے تعلیمی اداروں سے متعلق اعداد و شمار ملتے ہیں۔ ان سبھی اعداد و شمار اور تعلیمی تفصیل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہر صوبے میں صرف لڑکوں کے اسکول ہی تھے لڑکیوں کے اسکولوں کی تعداد اور طالبات کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ انگریزی دور حکومت میں ایڈم (Adam) کی یکے بعد تین رپورٹ بھی تعلیمی اعداد و شمار مہیا کرتی ہیں۔ ایڈم (Adam) کی رپورٹ کے مطابق مرشدآباد، بیر بھوم، بردوان، جنوبی بہار اور ترہت خطوں کے کل مدرسوں (اسکولوں) کی تعداد 2567 تھی جن میں بنگالی، ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی اور انگریزی میڈیم کے اسکولوں میں صرف چھ اسکول لڑکیوں کے لیے تھے اور مذکورہ سبھی خطوں کے اسکولوں میں داخل طلبا کی کل تعداد 30915 میں سے لڑکیوں کی کل تعداد صرف 214 تھی۔ انگریزی حکومت کے جبر و تشدد اور خوف کی وجہ سے انکوائری کے وقت بعض جگہوں پر لوگوں نے گھر کی عورتوں کی صحیح تعداد اور تعلیمی حیثیت بتانے سے گریز بھی کیا۔ سید نور اللہ اور جے۔پی۔نایک کے مطابق:

> ''ایڈم نے دوسری بات یہ بھی دیکھی کہ بعض دفعہ لوگ انکوائری سے اتنے خوف زدہ ہوگئے کہ انھوں نے گھر کی عورتوں کی صحیح تعداد کو چھپایا اور اکثر تو اسکولوں اور کالجوں نے بھی ''خوفناک تفتیش سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھا''

(ایڈمس رپورٹ، کلکتہ اڈیشن، صفحہ 220، بحوالہ تاریخ تعلیم ہند، صفحہ 42)

> سر فلپ ہارٹوگ نے بھی لڑکیوں کی تعلیم کے تئیں سماجی اور حکومتی سرد مہری کا ذکر کیا ہے اس نے لکھا ہے ''بڑے افسوس کی بات ہے کہ برطانوی ہند میں 1921 کی خواندگی کے اعداد و شمار اور ایڈم کی رپورٹ سے خواتین کی تعلیم پر کوئی تفصیلی اعداد و شمار میسر نہیں''۔

(سر فلپ ہارٹوگ Some Aspects on Indian Education صفحہ 84 بحوالہ سید نور اللہ اور جے پی نایک، تاریخ تعلیم ہند صفحہ 38)

اس پورے دور میں اعلیٰ تعلیمی اداروں میں لڑکیوں کی مایوس کن تعداد کے مقابلے میں اسکولی سطح پر ایک مختصر تعداد لڑکیوں کی شامل تھی لیکن

بعض علاقوں میں لڑکیوں اور ہریجنوں کو اسکولی تعلیم سے بھی محروم رکھا گیا۔ برطانوی عہد میں پہلی بار باضابطہ طور پر 1854 -Wood's Dispatch جسے ہندوستان میں تعلیم کا میگنا کارٹا (Magna Charta) کہا جاتا ہے میں تعلیم نسواں پر قدرے معقول سفارش پیش کی گئی ہے۔

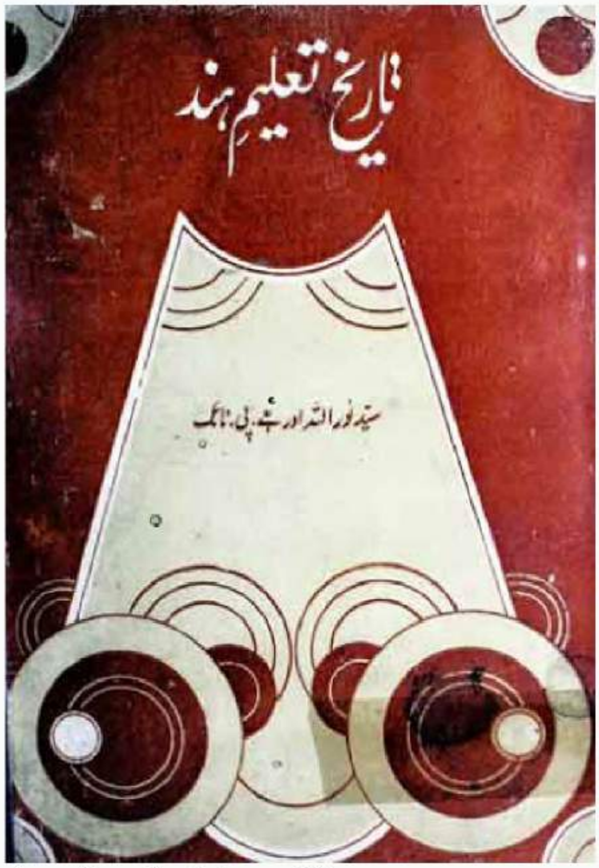

1913 میں لازمی ابتدائی تعلیم کے لیے پٹیل ایکٹ (وٹھل بھائی پٹیل) کے تحت چند شہری علاقوں میں لڑکیوں کے لیے بھی لازمی ابتدائی تعلیم کا اطلاق ہونے لگا۔ برطانوی ہندوستان میں عورتوں کی اعلی تعلیم میں قلیل تعداد کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ میں I.E.S آفیسروں کی تعداد (17-1916) میں 210 یورپین مرد اور نو (9) ہندوستانی مرد آفیسرس کے مقابلے میں صرف (19) یورپین عورتیں تھیں کوئی ہندوستانی خاتون اس عہدے پر فائز نہیں تھی۔ 22-1921 میں بشمول انگریز و ہندوستانی کل 373 مرد آفیسروں کے مقابلے میں 33 خاتون آفیسرس تھیں جس میں ہندوستانی آئی۔ای۔ایس خاتون آفیسرس کی تعداد صرف دو (2) تھی۔ اس اعداد وشمار سے 1920 تک ہندوستان میں خواتین کی اعلی تعلیم میں شمولیت، فراغت اور Placement کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

انگریزی اقتدار کا آخری تعلیمی منصوبہ جو سارجنٹ پلان کے نام سے 1944 میں پیش کیا گیا میں تعلیم نسواں پر پہلے سے زیادہ توجہ صرف کی گئی۔ لیکن اس پلان میں بھی لڑکیوں اور عورتوں کے لیے الگ سے تعلیمی ادارے، اسکول، کالج کی تعمیر کا کوئی خاص منصوبہ نظر نہیں آتا۔ اصل میں 1944 میں Post-war Educational Development in India پر سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن نے تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ اسی رپورٹ کو عرف عام میں سارجنٹ رپورٹ یا سارجنٹ پلان کہا جاتا ہے۔ اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ چالیس برس کے اندر ہندوستان میں تعلیم کو اس معیار پر پہنچا دینا جو برطانیہ میں حاصل کیا جاچکا تھا۔ اس رپورٹ کو آزادی سے قبل سب سے جامع اور مفصل تعلیمی پلان کہا جاسکتا ہے۔ اس کے بہت سارے نکات اب بھی کارآمد ہیں اور ہماری نئی تعلیمی پالیسی میں استعمال کیے جارہے ہیں۔ تعلیم کی دیگر سہولتوں کے ساتھ ساتھ تعلیم بالغاں پر بھی اس پلان میں زور دیا گیا۔ دس سے چالیس سال تک کے لڑکے لڑکیوں اور بالغ عورتوں ومردوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا جس میں عورتوں اور لڑکیوں کے لیے الگ سے درس وتدریس کا انتظام کیا گیا تاکہ خواتین کی صلاحیت کو فروغ دے کر سماجی ترقی کی کوشش کی جاسکے۔

آزاد ہندوستان میں نیشنل ایجوکیشن کمیشن 66-1964 جسے عرف عام میں کوٹھاری کمیشن کہا جاتا ہے پہلا باضابطہ کمیشن تھا جس نے تعلیم کے سبھی پہلوؤں اور سبھی سطحوں کے مسائل، وسائل اور امکانات پر اپنی سفارش پیش کی تھی۔ لیکن اس کمیشن سے قبل بھی کئی کمیشن اور کمیٹیوں نے تعلیمی ترقی کے کئی Aspects پر اپنی سفارشات پیش کی ہیں۔ آزادی کے فوراً بعد یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن (49-1948) جسے عام طور پر رادھا کرشنن کمیشن بھی کہا جاتا ہے، سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن (53-1952) جسے مدالیار کمیشن بھی کہا جاتا ہے، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن 1956 اور نیشنل وومین ایجوکیشن کمیٹی جسے اس کی چیئرپرسن درگابائی دیش مکھ (کمیٹی) کے نام سے بھی جانا جاتا ہے وغیرہ خاص کمیشن اور کمیٹیاں تھیں جنھوں نے آزادی کے فوراً بعد تعلیمی ترقی کے وسائل، مسائل اور امکانات کا جائزہ لیا تھا۔ یہ سبھی سفارشات اور ترجیحات ہندوستان میں تعلیم کی تشکیل نو کے متعلق تھے لیکن اس پورے دور میں لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم کے تئیں اتنی بیداری نظر نہیں آتی جتنی لڑکوں کی تعلیم کے تئیں آتی ہے۔ ہاں مگر خواتین کی تعلیمی ترقی کی شرح آزادی کے قبل کی شرح کے مقابلے میں تیز رہی۔ حالاں کہ سبھی کمیشن اور کمیٹیوں کی سفارشات میں خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی اور ترجیحات بیان کی گئیں لیکن ان کا نفاذ Implementation بہتر

طریقے سے نہ ہونے کی وجہ سے اعداد وشمار میں جتنی ترقی ہونی چاہیے وہ نہ ہوسکی۔ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے1958 میں درگا بائی دیش مکھ کی صدارت میں قومی خواتین تعلیمی کمیٹی بنائی گئی جس نے پس منظر، موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات کو سامنے رکھ کر سفارشات پیش کی مثلاً مرکزی حکومت کو ہر ایک صوبے میں تعلیم نسواں کی ترقی کے لیے خالص لڑکیوں کے لیے اسکولوں اور سہولیات کا انتظام کرنا چاہیے، دیہی علاقوں میں خواتین کی تعلیم کی بیداری وتشہیر کے لیے خصوصی کوشش کرنی چاہیے،خواتین کی تعلیمی ترقی کی بیداری کے لیے ریاستوں میں لڑکیوں اور خواتین کی تعلیمی کونسل قائم کرنی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ان نکات میں ہی لڑکیوں اور خواتین کے بہتر تعلیمی مستقبل کا راز پوشیدہ تھا۔

درگا بائی دیش مکھ کمیٹی کی رپورٹ جدید ہندوستان میں خواتین کی تعلیم کی ایک مستند رپورٹ کہی جاسکتی ہے کہ اس مسئلے پر اس سے قبل نہ تو اتنی شدومد سے غور وخوض کیا گیا اور نہ ہی خواتین کی تعلیم سے متعلق کوئی تفصیلی رپورٹ وسفارش پیش کی گئی۔ چنانچہ اس موضوع کے حوالے سے یہ ایک امتیازی ومنفرد دستاویز تھی جس کے مطابق عورتوں کی تعلیم کو ایک نہایت خصوصی مسئلہ سمجھ کر پنچ سالہ منصوبوں میں اس کے فروغ کے لیے رقم مہیا کرنے کی تاکید کی گئی۔اس رپورٹ کے مطابق مرکزی حکومت کو چاہیے کہ مرکزی سطح پر ایک نیشنل کونسل فار ومین اور ریاستی سطح پر اسٹیٹ کونسل فار ومین قائم کرکے لڑکیوں کی تعلیم کے فروغ کے کاموں کے لیے سرکاری و غیر سرکاری سطح کے باشعور لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر لاکر لڑکیوں کی تیز رفتار تعلیمی ترقی کے ضمن میں اقدامات کرے۔ عورتوں کی تعلیم کے پروگراموں کی دیکھ بھال کے لیے ہر ریاست میں ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن میں ایک اسپیشل آفیسر مقرر کیا جائے جو خواتین کی تعلیم کے متعلق پروگراموں کا انچارج ہو اور جس کی دیکھ ریکھ میں لڑکیوں کے اسکولوں کا معیاری معائنہ ہو۔لڑکیوں کی تیز رفتار تعلیمی ترقی کے لیے متعدد طرح کے خصوصی پروگرام مرتب کرنا، زیادہ سے زیادہ استانیوں کو ملازمت کے لیے تیار کرنا، لڑکیوں کے لیے مفت کتاب، تعلیمی ساز وسامان، امدادی وظیفے، ڈریس اور دوپہر کے کھانے وغیرہ کی سہولت فراہم کرنا بھی اس رپورٹ کی خصوصی ترجیحات تھیں۔1959 میں اس رپورٹ کو نافذ کرتے ہوئے درگا بائی دیش مکھ کی صدارت میں عورتوں کی تعلیم کے لیے نیشنل کونسل قائم کی گئی، متعدد ریاستوں میں بھی کونسل بنائی گئی، وزارت تعلیم میں خواتین کی تعلیم کا مخصوص شعبہ قائم کیا گیا۔ اکثر ریاستوں میں لڑکیوں کی تعلیم کی دیکھ ریکھ کے لیے انچارج اسسٹنٹ یا ڈپٹی ڈائرکٹر کی بحالی کی گئی اور لڑکیوں کے اسکولوں کے معائنہ کرنے کے اسٹاف میں اضافہ کرنے کے ساتھ اسے مستعد بھی بنایا گیا۔لڑکیوں کی تعلیم کے فروغ کے خصوصی پروگرام بنائے گئے اور تیسرے پنچ سالہ منصوبے میں اس کے لیے گیارہ کروڑ روپے مختص کیے گئے۔

درگا بائی دیش مکھ نے صرف لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ہی نہیں بلکہ بالغ عورتوں کے لیے بھی کئی طرح کے تعلیمی وتربیتی پروگرام بنائے جن کے ذریعہ خواتین کی تعلیمی ومعاشی ومعاشرتی حیثیت کو بہتر بنایا جاسکے۔اس ضمن میں سنٹرل سوشل ویلفیئر بورڈ نے ایک فلاحی اسکیم تیار کی۔ تاریخ تعلیم ہند کے مطابق:

> ''سنٹرل سوشل ویلفیئر بورڈ نے بالغ عورتوں کے لیے مختصر کورسز (کنڈنسڈ) کی ایک بہت دلچسپ اسکیم شروع کی ہے۔ اس اسکیم کے تحت 18سے 35 سال تک کی بالغ عورتوں کو جنہوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ شروع ہی میں منقطع کردیا تھا اور جو اب استانیوں، نرسوں اور مڈوائفوں کی حیثیت سے تیاری کرنا چاہتی ہیں دو یا تین سال کی جامع تربیت دی جاتی ہے اور انہیں مڈل یا ثانوی یا ثانوی اسکول کے آخری امتحان کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ کورسز بہت مقبول اور کامیاب ہوئے ہیں اور توقع ہے کہ ان کے ذریعے تعلیم کے فروغ اور ان سماجی خدمات کے لیے وہ زنانہ عملہ فراہم ہوگا جس کی ملک کو ضرورت ہے''۔

(سید نوراللہ اور جے پی نایک، تاریخ تعلیم ہند، صفحہ 508)

1947سے1960-61 تک کے ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کا اگر اعداد وشمار کی بنیاد پر جائزہ لیا جائے تو لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیمی ترقی کی شرح آزادی کے قبل کی تعلیمی شرح سے بہتر تو ہے لیکن لڑکوں کی تعلیمی ترقی کی شرح کے مقابلے میں بہت نیچے ہے۔

آزادی کے بعد سے 1960-61 تک کے اعلیٰ تعلیم کے جو اعداد وشمار موجود ہیں ان کے مطابق اس سطح پر آرٹس، سائنس، کامرس اور تکنیکی تعلیم کو شامل کرتے ہوئے اگر طلبا کی کل تعداد کا جائزہ لیا جائے تو ان سبھی Stream میں تعلیم حاصل کررہے لڑکوں کی تعداد آزادی کے وقت 2.33 لاکھ تھی جب کہ لڑکیوں کی شمولیت اس سطح پر صرف0.23 لاکھ ہی تھی جو بالترتیب1960-61 میں 8.09 اور1.77 ہوگئی۔ یہاں لڑکیوں / خواتین کی تعداد میں اضافہ تو ہوا لیکن لڑکوں / مردوں کے اضافے کی شرح کے مقابلے نہایت کم۔

خواتین کی تعلیمی ترقی کے متعلق کوٹھاری کمیشن کی سفارشات سے

قبل کئی اور ذیلی کمیٹیوں مثلاً ہنسا مہتا کمیٹی Hansa Mehta Bhaktavatsalam Committeeا Commitee(1962-64) وغیرہ نے بھی لڑکیوں اور خواتین کی تعلیمی ترقی سے متعلق اپنی سفارشات پیش کیں۔کوٹھاری کمیشن جس نے ہندوستان کی تعلیمی تشکیل نو کے تقریباً سبھی پہلوؤں پر غوروخوض کر کے اپنی سفارش پیش کی تھی نے خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ مرکوز کرتے ہوئے اس بات کی سفارش کی کہ طلبا وطالبات کے تعلیمی گیپ(Gap) کو کس طرح کم کیا جائے۔کمیشن نے اپنی سفارش میں مرکزی وریاستی انتظامیہ سے لڑکیوں کی تعلیم کے تئیں خصوصی مراعات اور توجہ دینے کی سفارش کی ۔کمیشن نے اس بات پر بھی زور دیا کہ Co-education کے ذریعہ خواتین کی تعلیم کے ہدف کو نہیں پایا جاسکتا اس کے لیے لڑکیوں اور خواتین کے الگ تعلیمی ادارے قائم کرنے چاہیے۔یہی نہیں بلکہ طالبات کے لیے ہاسٹل، ٹرانسپورٹیشن اور اسکالر شپ کا انتظام کر کے خواتین کی تعلیم کے خصوصی اہداف کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔اس نے لڑکوں کے ووکیشنل ایجوکیشن کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے ووکیشنل ایجوکیشن پر بھی زور دیا اور اس بات پر توجہ دلائی کہ 14 سال کی عمر تک جو بچیاں ترک تعلیم کرتی ہیں ان کو ووکیشنل ایجوکیشن کے ذریعہ خود انحصار بنایا جائے۔خواتین اور لڑکیوں کی خواندگی کو بڑھانے کے لیے زیادہ سے زیادہ داخلہ اور اسکول میں بنائے رکھنے کے اقدامات کے ساتھ خواندگی مہم بھی چلانا ضروری قرار دیا گیا۔ساتھ ہی ساتھ کامن اسکول سسٹم میں جو بھی پروگرام اور نصاب لڑکوں کے لیے تیار کیے جائیں وہ نصاب/پروگرام اور سہولیتیں طالبات کو بھی پہنچائی جائیں۔

قومی تعلیمی پالیسی1968 میں لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ صرف کرنے اور انھیں سماجی انصاف کے طور پر مساویانہ حقوق فراہم کرنے پر زور دیا گیا تھا۔اس کے علاوہ1974 میں نیشنل پالیسی ریزولیشن آن چائلڈ میں بھی گرل چائلڈ کوIgnore کرنے کی لعنت سے سماج کو باہر آنے اور قدرتی طور پر بچیوں کی پیدائش سے تعلیم تک کی تفریق کو ختم کرنے کی بات کہی گئی تھی۔یہ واضح رہے کہ آزاد ہندوستان کی معاشی ،سماجی ومعاشرتی زندگی کو بنیاد فراہم کرنے والے پنج سالہ منصوبہ میں بھی لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم وتربیت اور خود انحصاری کو یقینی بنانے کے لیے تقریباً ہر ایک پنج سالہ منصوبہ میں الگ سے رقوم مختص کی گئی۔

قومی تعلیمی نظام کو مزید فعال بنانے اور موجودہ اور مستقبل کے تعلیمی چیلنجوں سے مقابلہ کرنے کی غرض سے1985 میں نئی تعلیمی پالیسی کا مسودہ تیار کرنے کی منظوری ہوئی۔قومی تعلیمی کمیشن66-1964 کی سفارشات کوئی سمت دینے اور موجودہ وقت کے تعلیمی تقاضے کے مدنظر اس قومی تعلیمی پالیسی کی تشکیل عمل میں آئی۔1986 کے بجٹ اجلاس میں بحث کے بعد اسے قانونی شکل دی گئی اور یہ بھی پلان میں شامل کیا گیا کہ ہر پانچ سال کے بعد اس پالیسی کی کامیابیوں کا جائزہ لے کر اس کی خامیوں اور پروگرامنگ میں آرہی دشواریوں کو دوور کیا جائے گا۔چنانچہ92-1991 میں اس کا جائزہ لیا گیا جسے پروگرام آف ایکشن کا نام دیا جاتا ہے۔ماضی میں لائی گئی پالیسیوں، کمیشنوں کی سفارشات، پنج سالہ منصوبے کی کارکردگی اور مختلف تحقیقی اداروں کے ذریعہ پیش کی گئی سفارشات اور کارروائیوں کے تحت اس پالیسی جسے 'نئی تعلیمی' پالیسی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے میں خواتین کی تعلیم کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ مرکوز کی گئی۔اس بات کا پختہ ارادہ کیا گیا کہ ماضی کی ناانصافیوں، نابرابریوں کو ختم کرنے اور اب تک خواتین کو کمزور سمجھے جانے کے نظریے کو بدلنا چاہیے۔اس کے لیے پالیسی کے مطابق تعلیمی اداروں، ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ اور نصاب ساز اداروں کی تشکیل نو کی جائے گی۔تعلیمی اداروں میں خواتین کی تعلیم سے متعلق الگ سے تحقیقی مراکز قائم کیے جائیں گے۔تعلیم میں جمود وضیاع کے عمل کو روکنے اور خاص طور سے اسکولی سطح پر لڑکیوں کےdrop-out کی شرح کو بتدریج کم کرنے کے خصوصی اقدامات کیے جائیں گے۔تکنیکی اور پروفیشنل تعلیم و تربیت میں خواتین کی حصے داری کو یقینی بنایا جائے گا۔صنفی Stereotypes رویے کو ختم کیا جائے گا تا کہ روایتی اور دور جدید کے کام دھندھوں میں خواتین کی حصے داری نہ صرف بڑھائی جاسکے بلکہ اسے مساوی اور یقینی بھی بنایا جاسکے۔ظاہر ہے اس پالیسی کے نفاذ کے بعد تعلیمی وتربیتی سطحوں پر لڑکیوں اور خواتین کی تعلیم کی شرح میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔

آزادی کے بعد پیش کی گئی تقریباً تمام کمیشنوں کی سفارش اور بیان کی گئی پالیسیوں کی طرح ہی نئی تعلیمی پالیسی یعنی قومی تعلیمی پالیسی 2020 کو بھی عمل میں لایا گیا ہے اور دائمی ترقی کے لیے2030 تک معیاری تعلیم کے عالمی ہدف کا ساتھ دینے کے لیے ہندوستان کو بھی اپنی تعلیمی ترقی کو تشکیل نو کی ضرورت ہوگی تا کہ 2030 تک سبھی کے لیے معیاری تعلیم کا انتظام ہوسکے۔ظاہر ہے 'سبھی میں' وہ آدھی آبادی بھی آتی ہے جسے ہم خواتین کہتے ہیں۔لہذا خواتین کی آبادی کو معیاری تعلیم کے مواقع نہ پیدا کئے گئے تو سب کے لیے معیاری تعلیم کے حصول کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا۔اس لیے اس نئی پالیسی میں سابقہ سفارشوں اور پالیسیوں سے زیادہ پرزور اور پراثر طریقہ اپنانے کی بات کی گئی ہے۔اس پالیسی کے باب چھ(Chapter-6) Equitable and

Inclusive Education: Learning for All میں مذکورہ ہدف کو حاصل کرنے کے بہت سارے طریقے اور حکمت عملیاں بیان کی گئی ہیں۔اسی باب کے 6.2 میں Socio Economically Disadvantaged Groups (SEDGs) سماجی معاشی پسماندہ گروپس کے بچوں اور افراد کو بالخصوص خواتین اور Transgender، درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبائل، پسماندہ ذاتوں اور اقلیتی طبقے کے ساتھ ساتھ دورافتادہ خطوں، قصبوں اور گاؤں کے افراد کو تعلیمی سہولیات پہنچانے کی بات کہی گئی ہے۔ پہلی بار female کے ساتھ ساتھ Transgender کا تذکرہ کرکے اوران کو تعلیم کے زمرہ میں شامل کرکے سماجی انصاف کی بات کی گئی ہے۔ان گروپس کے بچوں کے لیے مختلف طرح کے ذرائع جوانھیں محفوظ طریقے سے اسکول تک پہنچاسکیں، ان کی تعلیمی دوری کو کم کرسکیں اور انہیں محفوظ طریقے سے تعلیم مہیا کرانے کی سہولیات اورطریقہ کار بہم پہنچاسکیں، پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

جدید ہندوستان کی تاریخ میں دستور ہند ایک ایسی مستند دستاویز ہے جو ہندوستان کے تمام شہریوں کو مساویانہ حقوق فراہم کرتا ہے۔دستور ہند کے تمہید Preamble، بنیادی حقوق Fundamental Rights، بنیادی فرائض Fundamental Duties اور ہدایاتی اصول Directive Principles تقریباً سبھی جگہ جنسی مساوات پر زور دیا گیا ہے اور نہ صرف دستور ہند میں جنسی مساوات کو بنیادی حقوق میں شامل کیا گیا ہے بلکہ ریاستوں کو خواتین کے حقوق کی ضمانت فراہم کرنے کی بات بھی کہی گئی ہے کہ ریاستیں خواتین کو سماجی، معاشی، معاشرتی تعلیمی اور سیاسی اختیارات کے حصول اور نفاذ کے ذریعہ اختیارات فراہم کریں۔ چنانچہ آرٹیکل 14 میں خواتین کے مساویانہ اور قانونی حقوق بیان کئے گئے ہیں۔ آرٹیکل A-15 میں ملکی قوانین مذہب، ذات، نسل اور پیدائشی مقام کی بنیاد پر امتیاز برتنے کو سختی سے منع کیا گیا ہے۔ آرٹیکل (3)15 میں مرکز و ریاستوں میں عورتوں اور بچوں کا خصوصی موقف بیان کیا گیا ہے جبکہ آرٹیکل 16 میں مساویانہ موقع کے تحت تمام شہریوں کے ساتھ خواتین کو بھی برابر کے روزگار یا عہدہ حاصل کرنے کی بات کہی گئی ہے۔آرٹیکل 39 میں ریاستوں کو ایسی پالیسی مرتب کرنے کی تلقین کی گئی ہے جس میں مردوخواتین دونوں کو مساویانہ مشاہرہ ومزدوری کے ساتھ مساوی طور پر روزگار حاصل ہوسکے۔اس کے علاوہ آئین کی مختلف دفعات میں خواتین کے لیے منصفانہ اورسازگار ماحول، بچوں کی ولادت کے بعد Maternity Leave، استحصال اور ناانصافی کے خلاف قانونی تحفظ، پنچایتی راج کے تحت ایک تہائی سیٹوں پر بشمول درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبائل کے خواتین کا انتخاب وغیرہ۔خواتین کے خلاف تشدد، ظلم و زیادتی، جہیز، اغوا، ریغمال، جسمانی اذیت، چھیڑ چھاڑ، جسمانی ہراسانی وغیرہ کے انسداد کے لیے تعزیرات ہند میں قانونی چارہ جوئی اورسزاوجرمانے کا التزام کیا گیا ہے۔

مذکورہ آئینی تحفظ اور قانونی التزام کومزید موثر اور فعال بنانے کے لیے 1990 میں قومی کمیشن برائے خواتین ایکٹ 1990 پاس ہوا۔اس کمیشن کے کارمنصبی میں ہندوستانی آئین اور دیگر قوانین وتحفظات کو بہتر ڈھنگ سے نافذ کرنااورخواتین کے متعلق تمام امور کی جانچ پڑتال کرنا ہے۔

لڑکیوں اور عورتوں کے تحفظ کے لیے سماج کومزید فعال بنانے کے لیے سماجی بیداری اور حقوق وفرائض کی پاسداری و ذمہ داری نبھانے کے لیے اور کئی قوانین مثلاً زچگی کے بعد ملنے والی سہولتوں کا حق، رحم مادر میں جنس کی معلومات کرکے حمل کے ساقط کرانے کے خلاف جنس کے انتخاب کی ممانعت، عصمت دری کے خلاف مفت قانونی چارہ جوئی کا حق، شخصی وقار کا حق، جائیدادوراثت کا حق وغیرہ وغیرہ ایسے حقوق ہیں جو لڑکیوں اور خواتین کو سماج میں مساویانہ حقوق کے ساتھ ساتھ باعزت و باوقار زندگی گزارنے کا سماجی، معاشی، معاشرتی وتعلیمی مواقع کا حق فراہم کرتے ہیں۔

مذکورہ قوانین، حقوق وفرائض کی تفصیل سے ایک بات ذہن میں ابھر کرآتی ہے وہ یہ کہ ایک مہذب اور جدید سماج میں لڑکیوں اور خواتین کے تئیں متعدد طرح کے تحفظ کے لیے قوانین بنانے کی آخر ضرورت ہی کیوں پڑی؟ تو اس کے جواب کے لیے ہندوستانی سماج کے ماضی پر غور کرنا بہتر ہے تا کہ اس بات کا پتہ لگایا جاسکے کہ وہ کون سی وجوہات تھیں جو خواتین کو مساویانہ حقوق سے دور رکھے ہوئے تھیں۔تو اس ضمن میں ذات پات کا نظام، مذہبی پابندیاں اور ثقافتی ورثہ کے ساتھ ساتھ پدرشاہی نظام زیادہ ذمہ دار ہے۔ یہ وجوہات کی وہ بنیادیں ہیں جن کے تحت ماضی میں لڑکیوں کی تعلیم پر پابندی، بہن، بیٹی، بیوی کو والد، بھائی اور شوہروں سے کمتر مانا گیا اور شخصی آزادی سے محروم رکھا گیا جن کی وجہ سے بال وواہ، ستی کا رسم اور دیوداسی نظام کو تقویت ملی اور پرش پردھان سماج کے نام نہاد ٹھیکے داروں نے اسے مہذب اور ثقافت سے جوڑ دیا تا کہ اسے رسم ورواج کا نام دے کر بڑھاوا دیا جاسکے۔ان سماجی بیماریوں کے علاوہ کئی طرح کے تعصب جن کا تعلق خاندان، سماج اور رشتے داروں سے ہے خواتین کے خلاف برتا جاتا ہے۔ پرانے سماجی اقدار میں لڑکوں کو خاندان کا چشم وچراغ مانا جاتا تھا اور لڑکیوں کو خاندان پر بوجھ۔اس لیے تمام تر سہولیات پہلے

لڑکوں کو پہنچائی جاتی تھی اور لڑکیوں کو بعد میں۔ خواہ وہ معاملات کھانے پینے سے تعلق رکھتے ہوں، پڑھائی لکھائی سے تعلق رکھتے ہوں یا پھر کسی سماجی پس منظر سے۔ ہندوستانی سماج میں یہ رواج دیہی علاقوں میں بہت حد تک اب بھی رائج ہے۔ چنانچہ مذکورہ قوانین وتحفظات کے تحت ان لعنتوں کو دور کر کے لڑکیوں اور عورتوں کی سماجی، معاشی اور تعلیمی صورت حال کو بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے اور بہت حد تک قانونی چارہ جوئی اور سماجی بیداری کے ذریعہ ان برائیوں اور عدم مساویانہ رویوں پر قابو پایا جاچکا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور سے اکیسویں صدی کی دوسری دہائی تک لڑکیوں اور خواتین کی تعلیمی ترقی کا سفر کافی جدوجہد سے بھرا رہا ہے۔ سیاسی اور سماجی شعور کے ساتھ ساتھ خواتین کی تعلیم ومعیار زندگی میں اضافہ تو ہوا ہے لیکن اب بھی اس ضمن میں بہت کچھ کیا جانا باقی ہے۔ اب بھی ان کے حصول تعلیم میں متعدد طرح کی رکاوٹیں اور دشواریاں حائل ہیں۔ اس بات کا اعتراف پچھلے صفحات کی رپورٹوں اور سفارشات میں کیا جاچکا ہے۔ لڑکیوں اور خواتین کی تعلیم کی موجودہ صورت حال تشفی بخش ہو چلی ہے تاہم چھوٹے قصبوں اور دیہی علاقوں میں اب بھی متعدد مشکلات کا سامنا ہے۔ ان مشکلات میں سماجی، معاشی اور انتظامی مشکلات سر فہرست ہیں مثلاً لڑکیوں کے لیے Separate Girls Schools کی کمی، اسکول کی رہائش سے دوری، Co-ed یعنی مخلوط اسکولوں میں بدنظمی کی وجہ سے جنسی ہراسانی وصنفی تعصّبات، اسکولوں سے گھر تک کے راستے میں جنسی ہراسانی، چھیڑ چھاڑ کے معاملات وغیرہ۔ والدین اور اساتذہ کا قدامت پرست رویہ، سماجی بندھن، رسم ورواج، پردہ سسٹم اور بال وواہ ایسے مسائل ہیں جن سے ہندوستان کے دیہی علاقے کی لڑکیاں اور عورتیں اب بھی نبرد آزما ہیں۔ دیہی خاندانوں میں صنف پر مبنی کام کی تقسیم، اسکولوں کے داخلے میں صنفی امتیازات، ترک تعلیم یا drop-outs کی شرح، گھریلو امور اور ذمہ داریاں، لڑکیوں کی تعلیم کے تئیں سماجی رویہ، اسکول گھر کے درمیان عدم تحفظ کا خوف وغیرہ ایسے مدعے اور مسائل ہیں جن پر بہر حال پوری طرح اور مستقل طور پر قابو پانے کی اشد ضرورت ہے۔

تمام مشکلات اور روکاوٹوں کے باوجود لڑکیوں اور عورتوں کا جدوجہد بھرا تعلیمی سفر جاری وساری ہے۔ سرکاری اعانت، قانونی امداد، آئینی تحفظ اور سماجی رویوں میں مثبت تبدیلی کی وجہ سے لڑکیوں اور خواتین کی تعلیمی شرح میں نہ صرف اضافہ ہو رہا ہے بلکہ ان کے معیار، تعداد، اور اختصاص میں بھی خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے۔ سماجی بیداری سے اور اکثر اسکولوں میں اساتذہ کے مثبت رویے سے بھی لڑکیوں کی تعلیم میں Sustainability اور تکمیل تعلیم کا رجحان بڑھا ہے۔ مرکزی حکومت اور متعدد ریاستی سرکاروں کے ذریعہ جدید طرز کے گرلس اسکولوں کی تعمیر وترقی مثلاً کستوربا بالیکا ودیالیہ، گرلس پروجیکٹ اسکولس اور بعض تعلیمی اداروں میں لڑکیوں اور عورتوں کے لیے داخلے میں ریزرویشن Open School کا قیام، ODL سسٹم کی ترویج وترقی، Girls and Community Polytechnics کا قیام، مفت کتابیں، ڈریس، تعلیمی ساز وسامان کے علاوہ ماہانہ وظیفہ، دیہی علاقوں میں سائیکل، شہری علاقوں میں سرکاری بسوں میں مفت سفر، مرکزی اور ریاستی سرکاروں کے ذریعہ گرلس ہاسٹل کا قیام اور مختلف طرح کے NGO's کے ذریعہ لڑکیوں وخواتین کی تعلیم میں اعانت وغیرہ ایسے وسائل ہیں جن کے ذریعہ خواتین کی تعلیمی مساوات کے رویے کو تقویت ملی ہے۔ درسی ونصابی کتابوں میں صنفی مساوات اور جنسی توازن کو برقرار رکھنے سے تعلیم کے تئیں لڑکیوں کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ تعلیم بالغاں کے تحت 15-35 سال کی عمر گروپ کی خواتین کی تعلیم اور تربیت سے ان کی سماجی ومعاشی صورت حال میں مثبت تبدیلی آئی ہے۔ اب شہری علاقوں میں داخلے کی شرح کا توازن برابر ہونے لگا ہے۔ اعلیٰ تعلیم میں عورتوں کی شمولیت بہتر ہوئی ہے۔ تکنیکی، طبی، سائنسی اور تحقیقی تعلیم کے میدان میں بھی خواتین نے خاطر خواہ ترقی کی ہے۔ جو شعبے خواتین کی دسترس سے باہر سمجھے جاتے تھے ان میں بھی اب خواتین کی نہ صرف شمولیت ہونے لگی ہے بلکہ خواتین نے اپنے ہونے کا احساس بھی دلایا ہے۔ غرض کہ تعلیم، سائنس، ٹیکنالوجی، صنعت وحرفت، انسانی وسائل، میڈیا، فلم انڈسٹری، تصنیف وتالیف، دفاع اور خلائی تحقیق کے اداروں میں بھی خواتین نے اپنی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ زندگی کے کئی شعبوں میں اب وہ مردوں سے بھی آگے بڑھ رہی ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب بشمول تعلیم زندگی کے تمام شعبوں میں خواتین مردوں کے ہم پلہ ہو جائیں گی۔

□□□

Dr. Reyaz Ahmad

Associate Professor & Principal i/c

MANUU College of Teacher Education.

Nuh, (Mewat) Haryana-107122

Email: reyazahmed045@gmail.com

Mob: 9052112740

ڈاکٹر انیسہ خاتون

مشائخ چشت کا نظام اصلاح وتربیت

صوفیاء کرام نے سرزمین ہند کو علم دنیا اور علم دین دونوں میں مالا مال کیا اور ان کی اصلاح وتربیت میں علم کو خصوصی مقام حاصل تھا۔

چشتی بزرگوں نے تصوف کی نظری صورت کو چھوڑ کر اس کی عملی شکل پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ اور انہیں اپنا پیغام عام کرنے میں جو کچھ کامیابی نصیب ہوئی۔ اس کا راز ملفوظات خوحرجگان چشتیہ ہیں ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کا ایک اہم اصول یہ رہا ہے کہ وہ مہر ومحبت خلوص ومروت، ہمدردی ورواداری سے انسانی قلوب کو ایک رشتہ ء الفت میں پرونے کی کوشش کرتے تھے۔ اسلام اور اسلام کے اصولوں کو اشاعت کے لیے جو طریقہ کار مشائخ چشت نے اختیار کیا تھا وہ زبان سے کسی اصول کی تبلیغ و اشاعت کو بے سود و بے کار سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب تک انسان کی زندگی خود ان اصولوں کی تفسیر نہ بن جائے۔ عمل میں ایک جاذبیت ہے۔ اس کا اثر زیادہ گہرا اور زیادہ پائدار ہوتا ہے۔

چشتی صوفیاء کرام نے اپنی خانقاہوں میں تربیتی نظام کو قائم کیا۔ جس کی بنیاد اخلاق کی درسی کتابوں میں نہیں بلکہ عملی جامہ پہنانے پر ہے۔ صوفیائے کرام نے سنت رسولؐ کو جاری رکھا اور بنی نوع انسان کے اخلاق واطوار فکر وعمل کو درست کرنے کی کوشش کی مشائخ چشت کے کارناموں کا سب سے اہم پہلو ان کے نظام اصلاح وتربیت سے وابستہ ہے۔ مشائخ چشت اپنے خلفا کو خلق میں رہ کر لوگوں کی جفاوقفا برداشت کرنے کی ہدایت فرماتے تھے۔ ان کا یقین تھا جو نفساتی بصیرت تجربے کی راہ سے آئے گی وہ زیادہ صحیح اور موثر ہوگی۔ ان بزرگوں کا ماننا تھا انسان کی صحیح تربیت وہ ہے جو اس کے ادراک احساس اور عمل کو درست کرے وہ صرف برے عمل سے پرہیز نہ کرے بلکہ برے خیالات اور برے احساسات سے بھی بچے۔ ان بزرگوں کی تربیت اور روحانی ترقی میں جو چیز سب سے زیادہ معاون ہوتی تھی۔ وہ شیخؒ کی صحبت تھی۔ ہر قسم کے آدمی ان مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور وہ ہر ایک کے دل کو سکون واطمینان پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ مشائخ چشت کا خیال تھا کہ انسان کے بہت سے رجحانات افکار اور احساسات ماحول ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اگر ماحول میں مناسب ردوبدل کر دیا جائے تو انسان کی بہت سی خرابیوں کی اصلاح ہو جائے۔

مشائخ متقدین کے ملفوظات تعلیم اخلاق کی سبیل وکوثر ہیں ان بزرگوں کی کوشش صرف یہی نہیں تھی کہ انسان کے ظاہر اعمال درست ہو جائیں بلکہ انسان کا دل برائی کی طرف راغب نہ ہو۔ صوفیائے کرام نے محبت الٰہی کو اپنا مقصدِ حیات قرار دیا تھا خدمت خلق کو انھوں نے اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا اس کا صلہ ارتقاء روحانی کی شکل میں ان کو ملا اور یہ

ارتقائے روحانی انسانیت کی تکمیل تھی۔

ان مشائخ نے جو تعلیمات اپنی ملفوظات میں دی ہیں۔ وہ سالک کو توبہ، استقامت ایمان، تلاوت قرآن، ریاضت، توکل، احترام، صبرو استقامت وغیرہ ہیں۔ بقول صاحبِ آئینہ ملفوظات۔ ''ہماری عملی و مذہبی وراثت کے جو قیمتی سرمائے ہیں ان میں خواجگان چشتیہ کے ملفوظات کے مجموعے شمار ہوتے ہیں۔

مشائخ چشت کے ملفوظات نظام اصلاح و تربیت کے نقطہ نظر سے صوفیائے حضرات نے منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے ہمیشہ توبہ صبر توکل، فقر ورع اور رضا، کو اپنا مقصد بنایا۔ امام صوفیا نے استقامت کو بھی ایک لازمی صفت قرار دیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ ملکوک الٰہی اللہ میں اعتدال کی روش اختیار کرے اور ان تمام صفات واوصاف کے حصول کے لیے اور ان کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے ہر وقت دعا کرتے رہنا بھی لازمی ہے کہ اس کے بغیر کسی چیز کا حصول ممکن نہیں ہے۔

سلوک کے مراتب میں اہل طریقت کے لیے مندرجہ ذیل دس شرطیں ضروری قرار دی ہیں۔ طلب حق، طلب مرشد کامل، ادب رضا محبت وترک فضول، تقویٰ، استقامت، شریعت کم کھانا کم سونا، لوگوں سے کنارہ کش ہونا صوم وصلوۃ کا پابند ہونا اسی طرح اہل طریقیت کے لیے بھی دس چیزیں لازمی ہیں۔

معرفت میں کامل ہونا کسی کو رنج نہ پہنچانا اور نہ کسی کی برائی کرنا لوگوں سے ایسی گفتگو کرنا جس سے ان کی دنیا اور آخرت بنے متواقع ہونا عزلت نشین ہونا ہر شخص کو عزیز اور محبوب رکھنا اور اپنے کو سلب سے حقیر اور کمتر سمجھنا۔ رضا وتسلیم کو راہ دینا ہر درد میں تکلیف میں صبر وتحمل کرنا نذر و نیاز اور توکل پسند ہونا۔

مشائخ چشت کی اصلاحی جدوجہد کا آغاز دینی تربیت سے ہوتا تھا۔ ارکانِ اسلام کی پابندی پر خاص زور دیتے تھے تاریخ مشائخ چشت نہ صرف خود نماز باجماعت کی پابندی کرتے تھے بلکہ تمام متعلقین پر اس معاملہ میں سختی برتتے تھے۔

روزہ۔ سلطان المشائخؒ کا قول ہے کہ روزہ بدکار کے لیے ڈھال اور نیک کار کے لیے جنت ہے۔

زکوۃ۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا کرتے کہ نماز اور زکوۃ قوام ہیں جو زکوۃ ادا نہیں کرتا۔ اس کی نماز بھی قبول نہیں ہوتی حج مکان کے بجائے مکین کو تلاش کیا جاتے تو بہتر ہے۔ حج صاحب استطاعت پر فرض ہے۔

تعلیم اخلاق مشائخ چشت کے اصلاحی پروگرام کا مرکز نقطہ اور محور تعلیم اخلاق تھا۔ وہ اس کو کار نبوی سمجھتے تھے۔

اصلاحِ نیت، استقامت، تحمل، توکل ایثار دیانت داری، عیب جوئی سے پرہیز وغیرہ نیت کی درستگی مشائخ کی نظر میں سب سے زیادہ اہم تھی مشائخ کا کہنا تھا کہ بغیر استقامت انسان کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔

ملفوظ نگاری کی ابتدا شیخ عثمان ہارونیؒ سے لے کر چشتیہ سلسلہ کے ہر بزرگ کی جانب کوئی نہ کوئی ملفوظہ ضرور منسوب کیا جاتا رہا ہے۔

حضرت خواجہ خوجگا عثمان ہارونیؒ کے ملفوظات انیس الارواح سے ماخوذ ہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین انیس الارواح میں حضرت عثمان ہارونیؒ کی 28 مجلسوں کے ملفوظات ہیں۔

قوال کے ذریعے سے بعض شرعی اخلاقی اور دنیاوی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً نماز اور شریعت کے فرائض کا منکر کام ہے۔ صدقہ دینا ہزار رکعت پڑھنے سے افضل ہے۔ تین شخص بہشت کی بو تک نہ پائیں گے۔ ایک جھوٹ بولنے والا۔ دوسرا کنجوس۔ تیسرا خیانت کرنے والا۔ صوفیائے کرام نے محبت الٰہی خدمت خلق اور تعلیم اخلاق کے فروغ کو اپنا مشن بنایا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی

آپ کی ولادت باسعادت 573ھ مطابق 1142 اور وصال 633ھ مطابق 1236 بتائی گئی ہے۔

حضرت خواجہ اجمیریؒ کا سلسلہ ولادت ساتویں درجہ میں حضرت اسحاق چشتیؒ تک پہنچتا ہے اس لیے اس نسبت سے خود بھی چشتی کہلائے۔ آپ ان عظیم المرتبت بزرگوں میں ہیں۔ جنھوں نے انسانیت کی بکھری ہوئی دین و دنیا، مادیت اور روحانیت میں ایک عظیم توازن پیدا کیا اور معاشرے میں حسن اخلاق تبلیغ دین اور اشاعتِ اسلام کی شمع روشن کی اور انسانیت کا درس دیا آپ نے رشد وہدایت کا جو درس دیا وہ ہماری تاریخ کا جلی عنوان ہے۔

ملفوظات سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ صاحب کے نزدیک اہل سلوک کے لیے اخلاق ومحاسن کا حامل ہونا ضروری ہے۔ ان کے نزدیک تصوف نہ علم ہے اور نہ رسم بلکہ مشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ایک خاص اخلاق ہے جو ہر لحاظ سے مکمل ہونا چاہیے۔ حضرت خواجہ کے نام کئی تصانیف منسوب ہیں مثلاً رسالہ درکب نفس، رسالہ وجودیہ، حدیث المعارف، گنج الاسرار، دیوان معین وغیرہ۔ آپ کی تصانیف میں انیس الارواح گنج الاسرار۔ حدیث المعارف اور دیوان معین شامل ہیں۔ حضرت معین الدین چشتی کے ملفوظات دلیل العارفین میں درج ہیں خلیفہ اعظم اور جانشین حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے مرتب فرمائی ہیں۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے خلفاء میں خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کو خاص مقام ومرتبہ حاصل ہے۔ قطب صاحب کے بعد ان کی جانشینی اور سلسلہ چشتیہ کے کاموں اور مقاصد کی تکمیل اورتوضیح کی ذمہ داری کا شرف انہی کو حاصل ہوا۔

سالک اپنے یہ کردار میں شریعت کا پابند ہو، جب اس سے کوئی بات خلاف شریعت سرزد ہوگی تو وہ دوسرے مقام پر ہوگا جس کا نام طریقت ہے اور جب اس میں ثابت قدم رہے گا تو جنت کا درجہ ہوگا اور جب اس میں بھی پورا اترے گا تو حقیقت کا مرتبہ پائے گا۔ جس کے بعد وہ جو مانگے گا اس کو ملے گا۔

دلیل العارفین ۔ اس کتاب میں خواجہ صاحب کی گیارہ صحبتوں کے ملفوظات جن کو حضرت بختیار کاکیؒ نے جمع کیے ہیں اس میں مختلف دینی مسائل وصوفیانہ رموز مثلاً نماز، وضو، طہارت جنابت غسل، صدقہ، شریعت و طریقت محبت الٰہی عشق الٰہی معرفت الٰہی گناہِ کبیرہ طہارت اہل سکوت دوزخ، فضلیت، سورہ فاتحہ وسورہ یٰسین، کشف وکرامات، محبت نیک و بد توکل توبہ اور تجرید چشتیہ مختصر مگر جامع اور بصیرت افروز اشارے وکنایے ہیں۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی پیدائش 505ھ وفات 632 دہلی میں سلسلہ پھیلانے والے حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ آپ قصبہ ماورالنہر اوش میں پیدا ہوئے۔

سیر العارفین میں لکھا ہے۔ خواجہ صاحب اوش سے نکل کر بغداد پہنچے، یہاں امام ابواللیث سمرقندی کی مسجد میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے بیعت ہوئے۔ آپ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے جلیل القدر خلفاء اکابر اولیا اور عظیم القدر صوفیہ میں سے تھے۔ ترک دنیا اور فقر وفاقہ میں ممتاز تھے یاد الٰہی میں بڑے مستغرق رہتے تھے۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اپنے پیرومرشد خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے حکم کے مطابق دہلی میں مقیم ہوئے اور دہلی کو سلسلے کا مرکز بنا کر رشد وہدایت ارشاد تلقین کا کام جاری فرمایا۔

خواجہ قطب الدین اجمیریؒ کے وصال کے بعد سلسلہ کے مرکزی نظام کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری ان کے سپرد ہوئی۔ چنانچہ سلسلے کا مرکزی نظام اجمیر سے دہلی منتقل ہوا۔ جہاں قطب صاحب کی کوششوں سے اسے بہت زیادہ عروج اور فروغ حاصل ہوا۔ دہلی میں اس وقت سلطان شمس الدین التمش حکمران تھے۔ علماء ومشائخ سے عقیدت کی بنا پر اسے قطب صاحب سے بھی بے پناہ تعلق تھا۔

خواجہ صاحبؒ نے اگرچہ اکابرین کے طریقے کے مطابق خود کبھی دربار سے تعلق نہیں رکھا مگر سلطان کا اپنی عقیدت وتعلق کی بنا پر خود قطب صاحب کا دہلی سے آنا برابر جاری تھا۔

خواجہ اجمیریؒ نے فرمایا اس شہر کو تمھاری پناہ میں چھوڑا قطب صاحبؒ سلسلے کے فروغ میں دہلی میں ہی مشغول رہے۔ خواجہ صاحب بختیار کاکیؒ کی کوششوں سے ہندوستان کے روحانی نظام کا مرکز بھی دہلی بنا اور اس طرح خواجہ قطب صاحب کے دہلی میں قیام سے چشتیہ سلسلے کے کل ہند مرکزیت کی بنیاد پڑی۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے خلفاء میں خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کو خاص مقام ومرتبہ حاصل ہے۔ قطب صاحب کے بعد ان کی جانشینی اور سلسلۂ چشتیہ کے کاموں اور مقاصد کی تکمیل اور توضیح کی ذمے داری کا شرف انہی کو حاصل ہوا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اپنے پیرومرشد تلقین کا کام شروع کیا۔

ملفوظات ۔ فوائد السالکین میں حضرت قطب صاحب کی سات مجلسوں کے ملفوظات ہیں جس کو حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ نے جمع کیے ہیں جس میں سالک کے لیے ضابطے مرتب کیے ہیں۔

سالک کم کھائے مگر کھانا صرف عبادت کی قوت کو قائم رکھنے کے لیے کھائے۔

صوفیائے کرام میں قطب الاقطاب قطب الاسلام ملک المشائخ سلطان الطریقت برہان الحقیقت رئیس السالکین امام العاملین سراج الاولیا تاج الاولیا کے القاب سے یاد فرمائے جاتے ہیں۔

خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ

آپ کی ولادت باسعادت مطابق 1179 اور وصال 444ھ مطابق 1265 ہے آپ 590ھ میں خواجہ بختیار کاکیؒ سے بیعت ہوئے اور 595ھ میں دہلی میں آپ کو اجازت وخلافت حاصل ہوئی۔ بعد ازاں آپ پٹن تشریف لے گئے جہاں مستقبل طور پر قیام پذیر ہوئے آپ اخلاق حمیدہ کے پیکر تھے۔ ہمیشہ فقیرانہ زندگی بسر کی۔ آپ کو جو ملتا وہ راہ خدا میں لٹا دیتے تھے۔ آپ کا مزار پرنور پاک پٹن میں ہے۔

ملفوظات

حضرت گنج شکرؒ کے ملفوظات کے دو مجموعے ہیں۔ راحت القلوب سیر الاولیا۔

راحت القلوب کو خواجہ نظام الدین الاولیا اور سیر الاولیا کو حضرت بدالحق نے مرتب کیا ہے۔

راحت القلوب میں بنیادی باتیں موجود ہیں۔ جو انیس الارواح

دلیل العارفین اور فوائد السالکین میں پائی جاتی ہیں۔اس کتاب کے آخری حصہ میں چشتیہ سلسلہ کے ادوار و وظائف اور ان کے فضائل و برکات کا ذکر ہے جو مذکورہ بالا ملفوظات میں نہیں ہیں شروع میں درویش کی مختلف صفات بتائی گئی ہیں۔مثلاً درویش کی صفت پردہ پوشی اور خود فراموشی ہے۔

درویش کو چاہیے کہ چار باتیں اختیار کرے

(1) اپنی آنکھوں کو بند کرے کہ خدا کے بندوں کے عیوب نہ دیکھ سکے۔

(2) کانوں کو بہرا کرے کہ جو باتیں سننے کے لائق نہ ہوں ان کو نہ سن سکے

(3) زبان کو گونگی کرے کہ جو باتیں کہنے کے لائق نہ ہوں ان کو نہ کہے۔

(4) پاوں کو لنگڑا رکھے کہ جب اس کا نفس کسی غیر ضروری یا ناجائز کام کی طرف لے جانا چاہے تو نہ جاسکے۔اگر یہ باتیں اسکو حاصل ہو گئیں تو وہ درویش ہے ورنہ وہ دروغ گو ہے۔صلاحیت دل حضرت گنج شکرؒ نے راہ سلوک میں دل کی صلاحیت پر زور دیا ہے اور اس کا سلوک کی اصل کہا ہے اور یہ صلاحیت اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو لقمہء حرام سے پرہیز اور اہل دنیا سے اجتناب کرتا ہے۔

سیراالاولیا میں بائیس فصلیں ہیں اور ہر فصل میں تصوف کے مستقل موضوع پر حضرت گنج شکرؒ کے ارشادات ہیں جس سے اس موضوع کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

ایک فصل میں بابا گنج شکرؒ نے فرمایا کہ عاقل وہ شخص ہے جو دنیا کے تمام معاملات میں اللہ پر توکل کرتا ہے توکل کی تشریح اس طرح کی ہے کہ میں متوکل کے ایمان میں خوف اور محبت ہو۔خوف سے وہ گناہ کو ترک کرتا ہے اور محبت سے خدا تعالیٰ کی رضا کے لیے تمام مکروہات سے باز آتا ہے۔

ایک موقع پر اپنے مریدوں کو ایک بزرگ کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ جب ایک آدمی تین باتوں سے اجتناب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے تین چیزیں اٹھالیتا ہے۔اول وہ شخص زکوۃ نہیں دیتا تو اللہ اس کے مال سے برکت اٹھالیتا ہے۔دوم جو شخص قربانی نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس سے عافیت چھین لیتا ہے۔سوم جو شخص نماز نہیں پڑھتا اللہ تعالیٰ مرنے کے وقت اس سے ایمان کو جدا کر کردیتا ہے۔

قرآن مجید کی تلاوت کے بارے میں فرمایا کہ:

''کوئی ذکر کلام الٰہی سے بڑھ کر نہیں۔اسے پڑھنا چاہیے کیونکہ اس کا پھل تمام عبادتوں سے بڑھ کر ہے۔

خواجہ نظام الدین اولیاءؒ

محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء 636ھ مطابق 1238 میں پیدا ہوئے اور وفات 725ء دہلی میں ہوئی۔آپ جد امجد بخارا سے برصغیر ہند آئے۔آپ نے اپنے علوم کی تکمیل دہلی میں کی۔655ھ میں بابا فریدالدین گنج شکرؒ کی خدمت عالیہ میں پاک پٹن تشریف لے گئے اور بیعت ہوکر خلافت و اجازت سے مشرف ہوئے۔آپ پابند شریعت تھے۔اپنی تعلیم میں محبت الٰہی پر زور دیا کرتے فرماتے تھے۔پیر ایسا ہونا چاہیے کہ جو احکام شریعت وطریقت وحقیقت سب کا عالم ہو۔آپ کے فیوض و برکات کے سبب معاشرے میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا ہوا۔ ہزاروں انسانوں نے بیعت کی اور ان کے اخلاق ومعاملات میں پاکیزگی اور سچائی پیدا ہوئی۔آپ نے ساری عمر تجرد کی زندگی گزاری آپ کا مزار مبارک دہلی میں درگاہ شریف نظام الدین اولیاء کے نام حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کے نام کے ساتھ جو مشہور ملفوظات منسوب کیے جاتے ہیں۔مندرجہ ذیل ہیں:

فوائد الفوائد،افضل الفواد،راحت المجسین،سیرالاولیاء۔

فوائد الفواد:

ہر زمانے میں فوائد الفوائد کی مقبولیت حاصل رہی ہے فوائد الفواد کو امیر حسن سنجری دہلی جو مشہور شاعر تھے مرتب کیا ہے۔امیر حسن حضرت شیخ کے خاص مریدوں میں سے تھے۔707ھ سے 719ھ تک جو کچھ مرشد کی زبان مبارک سے سنتے قلمبند کرلیا کرتے۔709ھ میں امیر حسن کے فوادالفواد کے نام سے ان ملفوظات کو موسوم کیا۔

اس کے بارے میں شیخ محدث دہلی نے لکھا ہے:

''کتاب درمیان خلفاء ومرشدان شیخ نظام الدین

دستوراست:۔ان کی نظر میں کمال چار چیزوں سے حاصل ہے۔

1۔قلتہ الطعام یعنی کم کھانے سے۔

2۔قلتہ الکلام یعنی کم بولنے سے۔

3۔قلتہ الصحبت یعنی لوگوں سے ملنے جلنے سے۔

4۔قلتہ الصنام یعنی کم سونے سے۔

افضل الفوائد:۔

افضل الفوائد الفوائد حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات ہیں۔جن کو امیر خسرو نے مرتب کئے۔امیر خسرو محبوب الٰہی کے خاص مریدوں میں سے تھے۔جب امیر خسرو نے شیخ کے ملفوظات کو افضل الفوائد کے نام سے لکھنا شروع کیے اور چند اوراق حضرت شیخ کی خدمت میں پیش کیے۔آپ نے دیکھ کر فرمایا

''نیکو نوشتہ ونام نیکو کردہ''

710ھ سے شروع کر کے 712ھ میں شیخ کی خدمت میں پیش کیا۔

راحت المحبین:

حضرت شیخ کے ملفوظات کا ایک مجموعہ ہے۔ جو ان کے کسی مرید نے راحت المحبین کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس میں 489ھ سے 690ھ تک کے ملفوظات درج کیے ہیں۔

نظام الدین اولیاء کے خلیفہ خواجہ برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات وارشادات جمع ہیں۔

حضرت امیر خسروؒ

حضرت امیر خسروؒ کی ولادت 651ھ مطابق 1253ھ ہندوستان میں ہوئی تھی۔ آپ کے نانا عمادالملک کا تعلق ایک رئیس گھرانے سے تھا۔ آپ کے نانا اور والد دونوں حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے بیعت تھے اور آپ خود 8 سال کی عمر سے ہی حضرت محبوب الٰہی کے حلقہ ارادت میں داخل ہوگئے تھے۔ آپ حضرت محبوب الٰہی کے اتنے مقرب تھے کہ آپ حضرت محبوب الٰہی کے محرم اسرار قرار دیئے حضرت امیر خسروؒ نے حضرت محبوب الٰہی کی عنایتوں کو ایک کتاب کی شکل میں افضل الفوائد کے نام سے جمع کیا ہے۔

حضرت امیر خسروؒ موسیقی کے بھی بہت دلدادہ تھے۔ آپ نے ہندی اور فارسی کے راگوں کے امتزاج سے 13 نئے راگ بھی ایجاد کیے تھے۔

حضرت امیر خسروؒ کے اشعار کی تعداد ۵ لاکھ تک بتائی جاتی ہے جو حمد باری تعالیٰ، نعت وعشق رسولؐ، منقبتِ اصحابؓ رسولؐ، رموز تصوف، حکمت و اخلاق مدح مرشد پر مبنی ہیں آپ کا وصال 725ھ مطابق 1325 میں ہوا۔ آپ کی تدفین سلطان المشائخ کے پائین میں ہوئی۔

حضرت مخدوم نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ

آپ کی پیدائش اودھ میں ہوئی آپ کے دادا خراسان سے آکر لاہور میں بس گئے تھے۔ جب آپ نے علوم ظاہری کی تعلیم مکمل کر لی تو آپ دہلی تشریف لائے اور اپنے وطن کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا آپ بے حد صابر متقی اور پرہیزگار تھے۔ آپ اپنے مرشد کے نقش قدم پر چلے آپ ہمیشہ اشاعت علم اور شریعت کی پابندی کرنے کی تلقین فرماتے تھے اسی وجہ سے آپ کو اپنے زمانے کا امام ابوحنیفہ کہا جاتا ہے

725ھ مطابق 181351 رمضان بروز جمعہ آپ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ کا مزار دہلی میں ہے۔ یہ علاقہ آج بھی چراغ دہلی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ حضرت چراغ دہلیؒ شاہی ملازمت کو روحانیت کے منافی سمجھتے تھے۔ اپنے پیرومرشد کے طریقے کے مطابق امراء ودربار سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ سلطان محمد بن تغلق کے ساتھ حضرت شیخ کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ حضرت کو زبردستی دربار میں بلاتے اور تکلیفیں پہنچاتے۔ سلطان کو رعایا پروری اور صداقت پر چلنے کی تلقین فرماتے تھے۔ تاکہ ایک پرسکون معاشرہ قائم ہو۔ جس میں مرید خدا خدا ذکر فکر مہارت و ریاضت میں سکون سے معروف ہوسکیں۔

ایک مجلس میں صرف شیخ چراغ دہلی نے اپنے سبھی مریدوں کو وصیت کی تھی کہ جو کام خدا اور رسول نے منع کیا ہے وہ نہ کریں مریدوں سے اکثر نماز کے متعلق ہدایت کرتے نماز زندگی کے کئی اعمال کو درست کر دیتی ہے خدا اسے نعمتوں سے مالا مال کرتا ہے مہمانوں اور مریدوں کو کھانا کھلاتے وقت خدا اور رسول کا پیغام سناتے اور ساتھ بیٹھ کر کھانے کی تاکید کرتے۔ مشقت کے بغیر کھانا پسند نہ کرتے اپنی پریشانی اور فکر کو ظاہر نہ ہونے دیتے۔ حضرت شیخ عمل تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ صبر سے آدمی بلند مقام حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ عمل اور برداشت شیوہ درویش ہے۔ ایک درویش کو چاہیے اگر اس پر فاقہ گزرے تو بھی اپنے خاص پیروں سے نہ بیان کرے۔ حضرت شیخؒ کا ارشاد ہے۔

بعد مجاہدہ ہی مقام مشاہدہ حاصل ہوا ہے اور مدار سلوک طے کرنے کے بعد مقام سلوک حاصل ہوتا ہے اور تمام دروازے کھل جاتے ہیں۔

یعنی صوفی جب تک خدا کے نزدیک پہنچنے کے لیے نیک راہ پر نہ چلے وہ اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔

دوسرے ملفوظات میں زیادہ مشہور ہے۔ اس میں نہ تو کوئی بے معنی کرامتیں ہیں اور نہ ہی مبہم اور لامعنی گفتار ہیں۔ اس میں بسا اوقات قرآن حدیث کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔ فقر وتوبہ، ریاضت، زہد، توکل قناعت، تقویٰ، اور گوشہ گیری بھوک پیاس ان سب سے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان مجالس کی جان ہے۔

خیر المجالس میں چشتیہ و دیگر اولیا اللہ کے عقائد ان کے احوال ان کے ارشادات و اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہ باتیں خیر المجالس کے مطالعہ سے اظہر من الشمس ہوتی ہیں۔ حضرت شیخ دہلی نے جو کچھ اپنی زندگی اور عمل میں برتا پیش کیا اور فرمایا۔ حمید قلندر نے اسے اپنی خوبصورت زبان میں دلکش پیرایہ میں حکایات وواقعات کی صورت میں خیر المجالس میں پیش کیا۔

حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے توبہ کے بارے میں فرمایا کہ لوگوں کی دلداری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا'' سب سے عمدہ اور افضل توبہ اس وقت سمجھی جاتی ہے جبکہ توبہ کرنے والا جس کام سے توبہ کرے پھر اس کے پاس تک نہ بھٹکے۔ اگر اس قسم کی توبہ نہ کی جائے تو وہ توبہ نہ ہوگی''۔

''بھوکوں کو کھلانا کھلانے کے بارے میں فرمایا ہے کہ:'' بھوکوں کو کھلانا ہر

مذہب پسند کرتا ہے اوراس سے بڑھ کر کوئی سعادت نہیں کہ بھوکوں کا پیٹ بھرا جائے اورانھیں آرام دے کران کے دل راضی کیے جائیں''۔مزید فر مایا کہ:لوگوں کی دلداری کرنے کے بارے میں کوئی چیز اس سے افضل اور بڑھ کر نہیں کہ کسی کے دل کو راحت پہنچائی جائے۔ یہ سب عبادتوں سے افضل ہے۔شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مطالعہ میں خیر المجالس رہی تھی۔ مختلف سلسلوں کے صوفیاء کرام چشت کی کتب ملفوظات سے متواتر آج بھی استفادہ کیا جا رہا ہے۔تمام ملفوظات کے مجموعے حضرت نصیرالدین چراغ دہلی کے اس بیان سے فرضی سمجھے گئے ہیں۔خیر المجالس کی مجلس یازدہم میں درج ہے۔

''خدمت شیخ نظام الدین می فرمود کہ من ہیچ کتابے نہ نوشتہ ام۔ زیرا کہ خدمت شیخ الاسلام فرید الدین و شیخ الاسلام قطب الدین وخودخو اجگان چشیت قدس اللہ اروا حہم واز مشائخ شیخ تصنیف نہ کردہ اند۔

اس بیان میں مجموعہ ملفوظات کے وجود سے انکار نہیں ہے۔جب خواجہ عثمان ہرونیؒ کے ایک ملفوظہ سے متعلق فرمایا:۔

ایں ملفوظہ الیشان نیست،ایں نسخہ ھا بر من رسیدہ اند۔ودراں جا بسیار الفاظہ نوشتہ

چشتیہ سلسلہ کی تاریخ کا وہ دور جو حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ سے شروع ہوا تھا۔شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی پر ختم ہوگیا۔

چشتیہ سلسلہ کا ایک مرکزی نظام تھا۔اسی مرکز سے تمام متعلقین سلسلہ کی روحانی اور اخلاقی زندگی کی اصلاح وتربیت ہوئی تھی۔امراء و سلاطین سے کسی قسم کا تصدیق رکھنا روحانی سعادت کے منافی سمجھا جاتا تھا۔حضرت چراغ دہلیؒ نے محسوس کرلیا تھا کہ ان گرد وپیش حالات میں کوئی شخص ایک کل ہند نظام کا بار گراں نہ سنبھال سکے گا۔ چنانچہ انھوں نے وصیت فرمائی کہ مشائخ سلسلہ کے لب تبرکات ان کے ساتھ دفن کر دے جائیں جب زمین نے آفتاب علم وارشاد کو آغوش میں لیا تو چشتیہ سلسلہ کا ایک تابناک دور ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

سید محمد گیسودرازؒ

آپ کے اسم گرامی سید محمد الحسینی لقب بندہ نواز گیسودراز ہے آپ کی ولادت 1321 بمقام دہلی ہوئی۔حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلیؒ کے جلیل القدر خلفاء اور ہندوستان کے مشاہیر اولیا میں سے تھے انیس سال کی عمر سے ریاضت کی طرف متوجہ ہوئے۔آپ نے انتہائی ریاضت کے ساتھ تمام علوم سیکھے۔آپ کی اس ریاضت سے حضرت چراغ دہلیؒ بھی متاثر ہوئے اوران کی شفقت روز بروز بڑھنے لگی۔

مرشد کی خدمت میں صبح سے شام تک مشغول رہے۔ایک بار آپ کے پیرومرشد حضرت نصیرالدین چراغ دہلی پالکی میں تشریف لے جا رہے تھے۔دوسرے مریدوں کی طرح آپ بھی پالکی اٹھائے ہوئے تھے۔چونکہ آپ کے بال بہت لمبے تھے۔اس لیے پالکی کے پایہ میں الجھ گئے آپ سخت تکلیف کے باوجود اپنے مرشد کی صحبتِ عقیدت واحترام کی وجہ سے کچھ نہیں بولے اور بدستور پالکی اٹھائے رہے۔

شمالی ہندوستان کے مقبول سلسلوں کے مشہور بزرگوں میں حضرت گیسودراز پہلے بزرگ ہیں کہ جنھوں نے تصنیف وتالیف کی طرف پوری توجہ دی۔آپ کی تصانیف کی تعداد 110 سے بھی اوپر بتائی جاتی ہے 80 سال کی عمر میں آپ دہلی سے دکن منتقل ہوگئے۔آپ گلبرگہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگئے۔22 سال تک رشد وہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ 1423 میں آپ اس عالم فانی سے کوچ کر گئے آپ کا مدفن بھی یہیں ہے اور گلبرگہ کی شہرت بھی آپ کی وجہ سے ہے۔

جوامع الکلم میں ہندوؤں اور برہمنوں کی نسبت فرماتے ہیں۔ایک مرتبہ ہندو پنڈت میرے پاس بحث کے لیے آئے اور ہمارے درمیان یہ طے ہوا کہ جو فریق بھی بحث میں کامیاب ہوگا فریق ثانی اس کی بات مان لے گا اور اس کا اتباع کرے گا۔باقاعدہ قول وقرار ہوگا بحث کی شروعات میرے حصہ میں آئی چونکہ میں نے سنسکرت میں ہندو مذہب کی کتابیں پڑھ رکھی تھیں اور ان کی ہر ہر روایات سے بخوبی واقف تھا۔خوب کھل کر بحث کی اور وہ میرے اوپر حاوی نہیں ہوسکے اور انھوں نے میری ساری باتوں کو قبول بھی کرلیا۔

کتابیات

1۔سوانح معین الدین چشتی /وحید احمد سعود

2۔تذکرہ اولیاء ہند /مرزا محمد اختر

3۔تاریخ مشائخ چشت /پروفیسر خلیق احمد نظامی

4۔بزم صوفیہ /سید صباح الدین عبدالرحمٰن

5۔سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات /پروفیسر خلیق احمد نظامی

6۔خیر المجالس /مولانا حمید قلندر

7۔برگزیدہ صوفیہء کرام /رضوان لطیف خان

□□□

Dr. Anisa Khatoon

J- 172, 3rd floor

Saket New Delhi

Contact No.7838925071

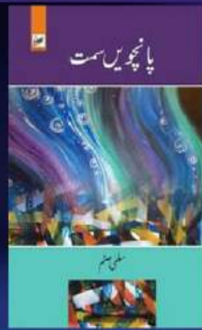

ڈاکٹر ارشاد شفق

سلمیٰ صنم کے افسانوں میں سماجی شعور

ادب کا تعلق سماجی زندگی سے بہت گہرا اور ناگزیر ہے۔ ادیب خواہ زمین وآسمان کی قلابیں ملائے، فضاؤں کی سیر کرے یا ستاروں سے سرگوشیاں کرے وہ کسی نہ کسی طرح معاشرے میں رہنے والے افراد سے ہم کلام ہوتا ہے اور انہیں کے شب وروز کی رودادیں پیش کرتا ہے۔ یہ روداد داخلی یا خارجی بھی ہوسکتی ہے لیکن اس عمل کے دوران ادیب شعوری یا لاشعوری طور پر دیگر مسائل حیات کے ساتھ ساتھ سماجی شعور سے بھی گزرتا ہے۔ ادیب نہ صرف معاشرے کی عکاسی کرتا ہے بلکہ وہ اس میں رہ کر اس سے آنکھیں چرانے کے بجائے ایک بہتر معاشرے کا تصور بھی رکھتا ہے اور ایک خوش آئند اور ترقی پذیر سماج کی بشارت بھی دیتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ادب کو زندگی کو خوشنما، بلند اور پاکیزہ بنانے کا ایک ذریعہ تصور کیا جاتا ہے کہ یہ نہ صرف سماج کو بدلنے کی طاقت رکھتا ہے بلکہ نئی زندگی کی تعمیر کا درس بھی دیتا ہے۔ ادب ایک فرد کے انفرادی تجربات کا اظہار ہوتا ہے لیکن اس اظہار میں ادیب کے فکر وفن میں اس کے اردگرد کے سماجی عناصر کسی نہ کسی صورت میں ہم آہنگ ہوتے رہتے ہیں۔ ادیب سماج کی عکاسی سے منھ موڑنا چاہے بھی تو وہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکتا کیونکہ فن پارے کو وجود میں لانے والے تجربات معاشرے اور اس کے مسائل کے تارعنکبوت سے جڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح ادیب چاہ کر بھی سماجی شعور سے خود کو الگ نہیں رکھ پاتا۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''سماج کی اساسی خصوصیت یہ ہے کہ بھان متی کا یہ کنبہ بھانت بھانت کی انفرادیتوں کی اینٹوں اور روڑوں کا مجموعہ ہے اور یوں فرد کی انفرادیت اور مختلف النوع انفرادیتوں سے جنم لینے والی اجتماعیت میں ہمیشہ کشمکش جاری رہتی ہے۔ سماج کا ایک رکن ہونے کی بنا پر فرد (عام انسان یا تخلیق کا) اگر ایک طرف ایک اجتماعیت کی تشکیل میں اپنی انفرادیت کی شمولیت کرتا ہے تو دوسری طرف اپنی انفرادیت کی بنا پر گریزاں بھی رہتا ہے۔ وہ اس سے بغاوت کرتا ہے۔''

(ڈاکٹر سلیم اختر، افسانہ حقیقت سے علامت تک، اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد، 1980، ص 132)

ادیب اپنی فکر میں بغاوت کا عنصر لاتے ہوئے بھی معاشرے سے دامن نہیں بچا سکتا۔ اس کی پرواز فکر کتنی ہی اونچی اڑان طے کرلے اسے اپنے اردگرد کے مسائل سے آنکھیں ملانی ہی پڑتی ہیں۔ ایسا اس لیے کہ ادب فوری طور پر سماجی تبدیلیوں کا اظہار نہیں کرتا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ پیش آنے والی تبدیلیوں کو اپنے اندر جذب کرتا اور معینہ مدت کے بعد اپنے عہد کے معاملات کو اس کی تاریخی صداقتوں کے ساتھ صفحہ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے۔ ادب سماج میں جنم لینے والے خیالات جو اس سماج کے مختلف النوع مسائل سے ترتیب پاتے ہیں، کا احاطہ اپنے منفرد انداز میں کرتا ہے۔

ادب کی دیگر اصناف کے برعکس فکشن اور بالخصوص ناول اور افسانے میں سماجی شعور کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے کیونکہ افسانہ نگار جن بنیادوں پر اپنے افکار کی دیوار کھڑی کرتا ہے اس کا خام مواد سماج کے مختلف مسائل سے ہی تیار ہوتا ہے۔ افسانہ نگار سماج کا ایک باشعور انسان ہوتا ہے اس لیے اس کے اندر معاشرے کے دیگر لوگوں کے برعکس احساس کی شدّت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کو فوراً محسوس کر لیتا ہے اور ان تمام مسائل کو اپنے مشاہدے اور تجربات کی آنچ میں تپا کر اپنی تخلیقات میں ہنر مندی سے پیش کر دیتا ہے۔ معاصر عہد کی دہلیز پر ایسے بہت سے افسانہ نگار سماجی شعور کے تحت افسانے تخلیق کر رہے ہیں لیکن خواتین افسانہ نگاروں کی صف میں سلمیٰ صنم کے یہاں اس کی باریکی عروج پر ہے۔ موصوفہ کے افسانے سماجی شعور کو اپنے اندر پوری شدّت کے ساتھ جذب کیے ہوئے ہیں جس کے مطالعے سے قاری ان کی معاشرتی دروبینی کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

سلمیٰ صنم عہد حاضر کی ایک معروف افسانہ نگار ہیں جن کے اب تک تین افسانوی مجموعے ''پانچویں سمت''، ''طور پر گیا ہوا شخص'' اور ''پت جھڑ کے لوگ'' منظر عام پر آ کر قاری سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ''قطار میں کھڑے چہرے اور دیگر کہانیاں'' ان کی ایک اور کتاب ہے جو متذکرہ مجموعوں کے بہترین افسانے پر محیط ہے۔ چونکہ سلمیٰ صنم کا تعلق اکیسویں صدی کے معاشرے سے ہے اور وہ اکیسویں صدی میں رہ کر افسانے کے خدوخال اُبھار رہی ہیں اس لیے ان کے یہاں موضوعات بھی اکیسویں صدی کے ہیں جن میں نئے سماج میں پنپنے والے مختلف مسائل ان کے افسانوں کا حصہ بنے ہیں۔ اس میں نہ کسی ازم کی پابندی ہے نہ کسی تحریک سے جڑے رہنے کا احساس نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے دیگر افسانہ نگاروں کی طرح گنے چنے موضوعات کو دہرایا نہیں ہے۔ یوسف عارفی نے ان کے افسانوں کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''متوسط یا کم متوسط طبقے اور ان کے افراد یہی سلمیٰ صنم کے افسانوں کی حقیقی دنیا ہے۔ ان کے افسانوں کا اظہار نیا ہے۔ پیش کش کی اختراع بھی ان کی اپنی ہے۔ وہ اپنی بات کو اپنے طور پر لکھنے کی ہنرمندی کو مضبوط تر بنانے کی جستجو میں لگی ہیں۔ ان کے افسانے پڑھتے ہوئے لگتا ہے وہ عصر حاضر میں لکھی جانے والی تحریروں سے نہ صرف مستفید ہو رہی ہیں بلکہ نیا لکھنے کی کوشش بھی کر رہی ہیں۔''

(سلمیٰ صنم، پت جھڑ کے لوگ، کرناٹک اردو اکاڈمی، 2012، بنگلور، ص48)

سلمیٰ صنم کے افسانوں کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے یہاں نئے معاشرے کے مسائل افسانے کے دامن سے لپٹے ہوئے ہیں یا یوں کہیے کہ ان کے افسانوں کا خمیر نئے سماجی شعور سے تیار ہوتا ہے۔ عہد حاضر کا سماج کئی برائیوں میں ملوث ہے۔ اس میں گھریلو زندگی کے مسائل سے لے کر فرد کے انفرادی مسائل بھی شامل ہیں جس سے موصوفہ چشم پوشی نہیں کرتیں۔ ان کا سماجی شعور بہت پختہ اور نکھرا ہوا ہے۔ انھوں نے سماج میں جھانک کر اپنی باریک بین نظروں سے اس کے اندر پیدا ہونے والی خامیوں کو اپنے افسانے کے قالب میں ڈھالا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے جدید معاشرے سے جڑے ہونے کے باوجود بھی افسانے کی ارضیت سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کرتے۔

سلمیٰ صنم کی کہانیاں عام انسانی مسائل کی کہانیاں ہے، جس سے عہد حاضر کا فرد نبرد آزما ہے۔ ''پانچویں سمت''، ''میری''، ''طور پر گیا ہوا شخص'' وغیرہ جیسے افسانے عام مرد و عورت کو موضوع بنا کر لکھے گئے ہیں جو سماج میں اپنے اوپر ہونے والے کرب کو جھیل رہے ہیں۔ بقول اسلم جمشید پوری:

> ''سلمیٰ صنم کے افسانے عام انسانوں کی کہانی لگتے ہیں، یہاں کوئی بہت بڑا فلسفہ نہیں ہے۔ وہ کسی تحریک، رجحان یا اسٹائل کی پیروی نہیں کرتیں۔ نہ ہی نام و نمود کے لئے افسانے لکھتی ہیں بلکہ افسانے لکھنا، ان کا مشغلہ ہے۔ ان کے اندرون کے اطمینان کا باعث ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ روزمرہ کی بول چال میں افسانے تخلیق کرتی ہیں۔ ان افسانوں میں پڑھنے والوں کے دل دھڑکتے ہیں۔ کردار کی حرکات و سکنات، انھیں اپنی لگتی ہیں اور قاری کہانی میں، کرداروں میں کہانی کے پیچ و خم میں ایسا گرفتار ہوتا ہے کہ سحر زدہ سا کہانی کے اندر ڈوبتا چلا جاتا ہے اور اسے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا یہ اسی کی کہانی ہے۔''

(اسلم جمشید پوری، سلمیٰ صنم کے افسانے: ایک جائزہ مشمولہ اسباق (مدیر نذیر فتح پوری)، جنوری تا جون 2016، پونہ، ص115)

سلمیٰ صنم کے افسانے زیادہ تر معاشرتی پہلوؤں کو اپنے اندر جگہ دیتے ہیں۔ انھوں نے جہاں سماج کے دیگر مسئلوں کو پیش کیا ہے وہیں ان کے یہاں گھریلو مسائل اور اس سے لڑ رہی عورت کی حقیقی زندگی کو بڑی فنکاری سے بیان کیا گیا ہے، ''آرگن بازار'' ان کا اچھا اور منفرد افسانہ ہے جس میں انھوں نے جہیز کی لعنت دکھائی ہے۔ موصوفہ کی یہ کہانی جہیز کی دوسری کہانیوں سے مختلف ہے۔ اس میں جہیز کی مانگ ساز و سامان پر طے

نہیں ہوتی بلکہ امیر شخص جہیز میں لڑکی (ثمن) کا گردہ مانگتا ہے جسے سلمیٰ صنم موجودہ معاشرے کو آرگن بازار سے تعبیر کرتی ہیں کہ اب ایسا وقت آگیا ہے کہ غریب لڑکیوں کی جہیز میں ان کے آرگن کا سودا ہوگا۔ بقول افسانہ نگار:

''ثمین کو لگا جیسے قیامت آگئی ہو، یہ اس نے کیا سن لیا تھا۔ گردہ اور جہیز میں دفعتہً اس کو لگا زمانے نے ایک لمبی سی جست لگائی ہے اور وہ دور آگیا ہے جب آرگن بازار وجود میں آچکے ہیں ...... کوئی زمانہ تھا جب انسان جانوروں کی طرح فروخت کیا جاتا تھا اور آج وہ ٹکڑوں میں فراہم ہونے لگا ہے۔''

(سلمیٰ صنم، آرگن بازار، مشمولہ ''قطار میں کھڑے چہرے اور دیگر کہانیاں'' عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2008، ص23)

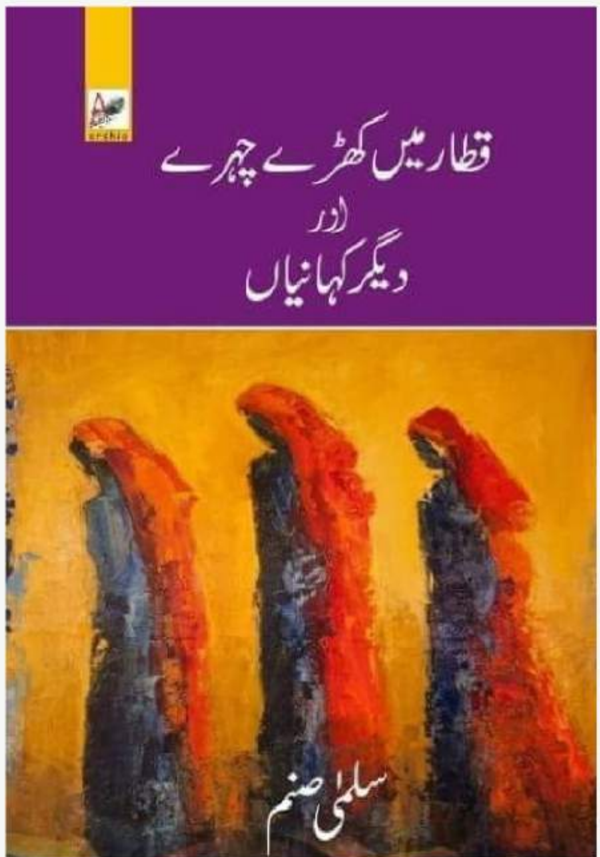

سلمیٰ صنم کے معاشرتی افسانوں کا محور عورت رہی ہے جس کے ذریعہ انھوں نے معاشرے کی خرابیوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ انسان کی گری ہوئی ذہنیت اور اس کے ناپاک ارادے کو انھوں نے اپنے ایک بہترین افسانے ''پانچویں سمت'' میں دکھایا ہے۔ اس افسانے کی تکنیک بہت عمدہ ہے۔ تمام مناظر قاری کی آنکھوں کی اسکرین پر چلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اولاد کی ضرورت ہر گھرانے کو ہوتی ہے لیکن عہد حاضر کا سماج اتنا گر گیا ہے کہ وہ اس کی چاہ میں اپنے ہی گھر کے فرد کو ایک ڈھونگی بابا کے سپرد کر دیتا ہے۔ رجنی کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ اکیسویں صدی میں جی رہی ہے اور اس طرح کی پراچین کال سے چلی آرہی روایت اس زمانے میں کوئی معنی نہیں رکھتی لیکن اسے جب اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ خود اس کی ساس اسے اس آشرم میں چھوڑ گئی ہے تو اس کا اس سماج اور یہاں کے لوگوں پر سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے اور وہ جس پانچویں سمت کی تلاش میں ہوتی ہے وہ اسے وہیں بھکتوں کے بھجن میں ایک دیوی کے طور پر محسوس ہوتی ہے۔ افسانے کا آخری اقتباس لاجواب ہے جو قاری کے ذہن پر تادیر اثر چھوڑ جاتا ہے:

''دفعتاً اس نے سنا کہیں دور سے آتی ہوئی بھجن کی آواز، سنگیت کی لے، بھگتوں کی جے جے کار، اس کو محسوس ہونے لگا جیسے وہ شکتی ہے وہ دیوی ہے، جو پاپیوں کا ناش کرتی ہے اور وہ پانچویں سمت جس کی کھوج لئے وہ سدا جوگن بنی پھرتی رہی تھی وہ آج خود اسی کے اندر روشن ہے۔''

(سلمیٰ صنم، پانچویں سمت، ایضاً، ص38)

سلمیٰ صنم کی باریک نگاہیں سماجی تغیرات پر بہت گہری ہیں۔ انھوں نے ان تغیرات کے ذریعہ درپیش آنے والے انسانی مسائل کو بہت قریب سے محسوس کیا ہے۔ ''میری'' جیسا افسانہ ان کی باریک سوچ اور سماج میں پنپنے والی سیروگیسی (Surrogacy) جیسی برائی پر مضمر ہے جس میں ممتا کی تڑپ اور ایک بچے کو زندگی دینے کی خواہش عروج پر ہے۔ یہ افسانہ سماج کے باطنی فکر سے جڑا ہوا ہے جہاں معاشرہ اس دہلیز پر پہنچ گیا ہے کہ جارج اور میری جیسے لوگ اپنی زندگی بنانے کے لیے سیروگیسی کا سہارا لیتے ہیں۔ اس افسانے میں میری ایک (Surrogate mother) کے طور پر سامنے آتی ہے جو نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا بچہ پیسے کے عوض بھومیکا کو سونپ کر اپنے وجود کو ادھورا محسوس کرتی ہے۔ اسی طرح لڑکی کی پیدائش کو ہمارا سماج مضر تصور کرتا ہے جسے موضوع بنا کر سلمیٰ نے ''یخ لمحوں کا سفر'' جیسا افسانہ لکھ کر قاری کو دعوتِ فکر دی ہے۔ منصور اور ثانیہ کے کردار کے ذریعہ انھوں نے عہد حاضر کے معاشرے کی ذہنیت کو پیش کیا ہے اور لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ اگر ایسا ہی چلتا رہا تو ایک دن عورت Endangered species بن کر رہ جائے گی۔ افسانے میں سلمیٰ کا واضح نقطۂ نظر بھی اُبھر کر سامنے آتا ہے جو براہ راست معاشرے سے سوال بھی ہے اور اس پر طنز بھی:

''ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بیٹی کی پیدائش پر خوشی صرف طوائف خانوں یا چکلوں پر منائی جاتی ہے...''

(سلمیٰ صنم، بخ لمحوں کا سفر، ایضاً، ص 100)

''کٹھ پتلی'' کی کہانی اگرچہ عورت کی کہانی ہے لیکن یہ افسانہ سلمیٰ کے دیگر افسانوں میں اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ اس کا نسوانی کردار حالات سے دوچار ہونے کے باوجود بھی خاموش نہیں رہتا۔ اپنے شوہر کی گھٹیا کرتوت کے بعد آسیہ بچپن کی سکھائی ہوئی یہ بات بھی بھول جاتی ہے کہ شوہر مجازی خدا ہوتا ہے اور ہر حال میں اس کی آؤ بھگت کرنا بیوی کی ذمہ داری ہے۔ وہ ساری عمر اس کی خدمت کرتی ہے لیکن شوہر کی کرتوت کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے بجائے خود کے کٹھ پتلی بنے رہنے کے وجود سے باہر آجاتی ہے۔ آسیہ کا یہی روپ اس افسانے کی جان ہے:

''اف!! کس بے وفا سے میں نے عمر بھر وفا کی تھی۔ میرا من بہک اٹھا۔ پندار کو زبردست ٹھیس لگی۔ انا کا ناگ پھن پھیلائے کھڑا ہوگیا۔ میرے کون ومکاں میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ نہیں آسیہ نہیں۔ تم اس Puppet Show کی کٹھ پتلی نہیں۔ اور میں نے اپنے اندر ایک عورت کو جاگتے محسوس کیا جس کا اپنا ایک ذہن تھا۔ آواز بھی تھی۔''

(سلمیٰ صنم، کٹھ پتلی، ایضاً، ص 63)

''پت جھڑ کے لوگ'' کا پلاٹ بہت پیچیدہ ہے۔ تاہم یہ بھی ہمارے معاشرے سے جڑی ہوئی کہانی ہے۔ شوہر کا اپنی بیوی پر شک کرنا ہمارے گھریلو اذہان کا حصہ رہا ہے۔ اس افسانے میں بھی مدثر اپنی پوری زندگی اپنی بیوی کو ایک غیر شخص کی محبت میں گرفتار ہونے کے شک میں گذار دیتا ہے۔ افسانے میں عورت کی لاچاری کا عنصر بھی اُبھرتا ہے جہاں اس کی اپنی اولادیں اس کی دیکھ بھال کرنے سے گریز کرتی ہیں۔ لیکن افسانے کا اصل دارومدار بھکشو کے کردار پر قائم ہے۔ یہ افسانہ کرشن چندر کا افسانہ ''پورے چاند کی رات'' کی کہانی سے تھوڑا بہت میل کھاتا ہے جس میں پورے چاند کی رات میں لڑکی اپنے والد سے جھوٹ بول کر اپنے محبوب سے ملنے جاتی ہے اور وہ اسے دور سے ایک لڑکے کے ساتھ باتیں کرتا دیکھ کر ہمیشہ کے لیے چلا جاتا ہے اور پھر کئی سالوں بعد اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ واپس اسی گھر میں آتا ہے جہاں ان دونوں پر یہ راز افشا ہوتا ہے کہ اس رات وہ جس لڑکے سے مخاطب تھی وہ اس کا بھائی تھا۔ سلمیٰ کے افسانے کی کہانی اگرچہ کچھ اور ہے لیکن اس میں موجود بھکشو (ثنا) کے کردار میں کرشن چندر کے اسی محبوب کا کردار نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن کہانی کا اہم پہلو سیما کے شوہر کی بے وفائی ہے جو ثنا کے نہ ہونے کی سزا پوری زندگی اپنی بیوی سیما کو دیتا رہتا ہے۔

سلمیٰ صنم چونکہ سائنس کی طالبہ رہی ہیں اس لیے سائنسی فکر ان کے افسانوں میں نمایاں نظر آتی ہے۔ انھوں نے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے اس میں بھی سائنس کا عمل دخل موجود ہے۔ سیروگیسی (Surrogacy) یا ایڈز (AIDS)، ایبولا (Ebola) اور الزائمر (Alzheimer) جیسی بیماریوں کو موضوع بنا کر سماجی گندگی کو دکھانا ان کے افسانوں کا لازمی حصّہ ہے۔ ایڈز (AIDS) جیسی بیماری پر انھوں نے ''مٹھی میں بند چڑیا'' جیسا لازوال افسانہ لکھا ہے جس میں ایک طرف جہاں ایڈز کے اثرات دکھائے ہیں تو وہیں عورت کے کرب کو نمایاں کر کے بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ سراج کا اپنی کزن (شعاع) کے ساتھ بار بار جنسی تجربہ کرنا ہرگز جائز نہیں۔ لیکن ایڈز جیسے موذی مرض میں سراج گرفتار ہوتا ہے وہ شعاع کو اس لیے چونکا دیتا ہے کہ مرد کی ہر غلطیاں اور برائیاں سماج میں معاف کر دی جاتی ہیں لیکن اس کی ایک آنچ بھی اگر عورت کے دامن پر لگ جائے تو اس کی پوری زندگی اجیرن بن کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ گھریلو معاشرے کے تشدد کی اس آگ میں وہ چپ چاپ جلتی رہتی ہے۔ افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ ہوں جو پورے افسانے کا نچوڑ پیش کر دیتا ہے:

''کوئی ہلکی سی چنگاری، کوئی ننھا سا شعلہ۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس کے بدن کی مٹی بھی خراب ہوچکی ہو۔ راجو بھیا کے تھوڑے سے کیڑے اس کے اندر بھی سرایت کر گئے ہوں۔ اس کے جسم کے خلئے بھی آہستہ آہستہ ٹوٹ رہے ہوں۔ اس کے جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ آہستہ خرامی سے مرتا جا رہا ہو۔''

(سلمیٰ صنم، مٹھی میں بند چڑیا، ایضاً، ص 56)

ایبولا اور الزائمر جیسی بیماریوں کے اثرات پر انھوں نے ''قطار میں کھڑے چہرے'' اور ''بھیگے کاغذ میں لپٹے ہوئے لمحات'' لکھے ہیں جو سلمیٰ کے سائنسی دروبینی سے افسانوی ادب کا حصّہ بنے ہیں۔ سماجی شعور کے لحاظ سے ان افسانوں کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ کوئی بھی بیماری ہمارے معاشرے اور اس میں سانس لے رہے فرد سے الگ نہیں ہوتی اور ان کے مضر اثرات سماج اور فرد دونوں پر پڑتے ہیں۔ ''ایبولا'' (Ebola) میں انھوں نے ایبولا جیسے وائرس (virus) سے برباد ہوتے ایک بھرے پورے کنبے کو دکھایا ہے تو وہیں ''بھیگے کاغذ میں لپٹے ہوئے لمحات'' میں الزائمر کی وجہ سے محض ایک شخص ہی نہیں بلکہ اس کا پورا خاندان پریشانی کا شکار ہوتا ہے۔ سلمیٰ صنم کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے اس نہج کے افسانوں میں

مایوسی کا اظہار نہیں کرتیں بلکہ ان کے کردار اس حالات اور ماحول سے لڑنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ مذکورہ افسانے کے آخر میں ایڈورڈ کی بیٹی کے یہ جملے پوری افسانوی فضا کو سوگوار کر دیتے ہیں جس سے افسانہ نگار کا نقطۂ نظر پورے طور پر قاری کے سامنے واضح ہو جاتا ہے:

''مما ڈرتی ہیں مگر میں نہیں ڈرتی۔ الزائمر آج لاعلاج ہے۔
کل تو نہیں ہوگا۔ میں خود ایک ڈاکٹر ہوں اور الزائمر کو چیلنج
کرتی ہوں۔
اے الزائمر شاید تم مجھے ایک دن پالو گے مگر اس سے پہلے میں
تمہیں ڈھونڈ لوں گی۔''

(سلمیٰ صنم، بھیگے کاغذ میں لپٹے ہوئے لمحات، ایضاً، ص145)

سلمیٰ صنم اپنے افسانے میں سماجی شعور کے حوالے سے فرد کے کئی مسائل کو سامنے لاتی ہیں۔ انھوں نے فرد کے سماجی مسائل کا بغور مشاہدہ کیا ہے جس پر وہ خاموش احتجاج کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے افسانے ایک طرف معاشرتی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں جو عہد حاضر کے مسائل سے لبریز ہیں۔ ان کے تخیل کی رفعتیں اپنے سماج میں پیوست نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے کسی ایک موضوع کا احاطہ نہیں کرتے۔ عورت ہونے کی وجہ سے ان کے یہاں محض عورتوں کی داستان گوئی نہیں ملتی بلکہ انھوں نے اپنے بالغ شعور کے ذریعہ سماج کے دیگر مسائل کو بھی جگہ دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں انسانی اقدار کی تبدیلی، فرد کی انا پرستی، انسانی بے حسی اور انسان دوستی وغیرہ جیسے موضوعات کو بطور خاص برتا گیا ہے، جس کا موضوع اور محور عورت نہیں ہے۔ یہ کہانیاں عورت ذات کے مسائل سے الگ ہو کر اپنے انفرادی مسائل کی وجہ سے قاری کو اپنی اہمیت کا احساس دلاتی ہیں۔ مثلاً ان کا افسانہ ''سورج کی موت'' انسانی اقدار کی تبدیلی پر بہترین افسانہ ہے جس میں (Tenancy Act) کے تحت اقدار بدل جاتے ہیں اور سیٹھ ساہوکاروں کا سارا رتبہ اور بھرم ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ حکومت کا یہ ایکٹ برابری کا قانون نافذ کرتا ہے جس میں قابلیت اور کامیابیوں کی سیڑھیاں چڑھنے کی طاقت ہوتی ہے وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ سلمیٰ صنم بڑی فنکاری سے واضح کرتی ہیں کہ وقت بدلنے میں دیر نہیں لگتی اور سماج کی بنائی ہوئی اونچ نیچ اور ذات پات کی جکڑ بندیاں اصل میں کھوکھلی روایت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ افسانے کے یہ جملے دیکھئے جو سماجی نابرابری کی تمام دیواروں کو ڈھا دیتے ہیں:

''.... سب بھول چکے تھے کہ وہ رمضان کا وہی لونڈا ہے جو
اپنی ننگی پیٹھ پر سورج اٹھائے حویلی کی بکریا چرایا کرتا تھا، ان
کے لیے تو وہ اب ڈی سی کامران تھا جس کی وجاہت، لیاقت
اور مالی حیثیت سے ہر کوئی مرعوب تھا، آج لیاقت خاں کی پڑ
پوتی کی کوئی اہمیت نہ تھی، جو تھا وہ ڈی سی کامران تھا، وہاں
کوئی یہ نہیں کہہ رہا تھا کہ کامران خوش نصیب ہے جو اسے
ساہوکار کی بیٹی مل رہی ہے، بلکہ ہر ایک کی زبان پر یہی تھا کہ
قمر خوش قسمت ہے جو اسے کامران مل رہا ہے۔''

(سلمیٰ صنم، سورج کی موت، ایضاً، ص48)

''پگلا''، ''طور پر گیا ہوا شخص''، ''تھکی ہوئی ناری''، ''دوسرے مذہب کا آدمی''، ''وہ پرندہ''، ''وہ دنیا کہاں ہے'' اور میرے محافظ'' وغیرہ جیسے افسانے الگ نوعیت کے ہیں جس میں موجودہ معاشرہ، آج کے فرد کی داخلی کیفیت اور دم توڑتی انسانیت کو فنکاری سے پیش کیا گیا ہے۔ ''پگلا'' میں انسانی بے حسی ''طور پر گیا ہوا شخص'' میں بیرونی ممالک میں جا کر بسنے والوں کی گھریلو زندگی، ''تھکی ہوئی ناری'' میں فیملی سپورٹ، ''دوسرے مذہب کا آدمی'' میں انسان دوستی کے عناصر، ''وہ پرندہ'' میں انسان کی گھٹیا سوچ، ''وہ دنیا کہاں ہے'' میں آپسی قرب ''کوئی اور خدا کی مخلوق'' میں اسٹریٹ بچوں کے حالات کو موضوع بنا کر عہد حاضر کے سماج اور افراد کی نشاندہی کی گئی ہے۔

سلمیٰ صنم کے ان افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے بڑی فنکاری سے قاری کی توجہ معاشرتی زوال اور انسانی بے رحمی کی طرف دلائی ہے۔ ان کے تخلیقی تجربات سماجی شعور سے بہت حد تک مربوط ہیں۔ وہ اپنی سیدھی سادھی کہانی اور بیانیہ کے سیدھے سادھے انداز کے ذریعہ قاری پر ایک دیرپا نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں جہاں سماجی نابرابری کا عکس نمایاں نظر آتا ہے وہیں نئے ماحول اور نئے سماجی مسائل کی گونج بھی سنائی دیتی ہے جسے موصوفہ کسی بھی حال میں برداشت کرنا پسند نہیں کرتیں۔ یہ افسانے گہرے سماجی شعور کا پرتو ہیں جو بہت محسوسات اور تجربات کے بعد تخلیقی عمل سے گزر کر فن پارے کا حصّہ بنے ہیں۔

□□□

Dr.Irshad Shafaque
H.No: 1/A, BL No: 23, Kelabagan
Po: Jagatdal, Dist: 24 Pgs(N),
Pin: 743125, (West Bengal)
Ph: 8100035441/7003101909
Email:Irshadnsr5@gmail.com

صدام حسین

عصری اردو افسانہ اور شائستہ فاخری

خواتین کے حوالے سے اتر پردیش میں اردو افسانے کا سب سے روشن دور بیسوں صدی کے اواخر میں شروع ہوتا ہے۔ اس دور پر نظر ڈالیں تو افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد نظر آتی ہے جنھوں نے افسانے میں کہانی پن کی بازیافت، موضوعات کا تنوع، اسلوب کی جدت اور عصری حسیت کے حوالے سے فن افسانہ نگاری کے جملہ مطالبات کو پورا کرتے ہوئے افسانے لکھے۔ معاصر خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں سماجی حسیت پائی جاتی ہے اور جدید معاشرہ ان کے افسانوں میں متحرک نظر آتا ہے۔ معاصر اردو فکشن میں شائستہ فاخری ایک اہم نام ہے۔ ادبی ذوق انہیں ورثہ میں ملا ہے۔ فنی شعور، تہذیبی شائستگی اور ادب وفن سے گہرے لگاؤ کے سبب انھوں نے چند ہی برسوں میں اپنی انفرادی شناخت بنائی ہے۔ وہ خود لکھتی ہیں:

> ''سچ تو یہ کہ خوف میں نہ سوچا جاسکتا ہے اور نہ لکھا جاسکتا ہے۔ اچھا لکھنے کے لیے حدیں توڑنا پڑتی ہیں، سرحدیں پھلانگنا پڑتی ہیں۔ کھلی فضا، کھلے ماحول میں قلانچیں مارنی پڑتی ہیں۔ تب جا کر کوئی تخلیق صحیح طور پر وجود میں آتی ہے اور تبھی تخلیقی ہنرمندی کا قرض ادا ہو پاتا ہے۔''

(میرا تخلیقی سفر، مشمولہ: اداس لمحوں کی خود کلامی، شائستہ فاخری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2011۔ ص:12)

شائستہ فاخری کے مطابق تخلیق کار کو کسی نظریے، تحریک یا ازم کی پیروی یا دباؤ میں نہیں لکھنا چاہیے بلکہ تخلیق کار بلاخوف وخطر آزادانہ طور پر رہ کر ہی تخلیقی کاوشوں کا حق ادا کرسکتا ہے۔ جب تک وہ خوف کی دبیز چادر کو اوڑھے رہے گا اس وقت تک تخلیق کے ساتھ انصاف ناممکن ہے۔ آزادی، یکسوئی اور تن دہی تخلیق کار کے لیے بنیادی شرائط ہیں۔

شائستہ فاخری کا تعلق الٰہ آباد کی مشہور خانقاہ دائرہ شاہ اجمل سے ہے۔ شائستہ فاخری نے اس دور میں لکھنا شروع کیا جب الٰہ آباد خوف و دہشت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ آئے دن فسادات، شوروغل اور ہنگامے ہوتے رہتے۔ افراتفری اور وحشت کے اس ماحول میں ہر انسان اپنے آپ کو غیر محفوظ خیال کرتا۔ یہی ماحول شائستہ فاخری کی کہانیوں کا محرک اور نقطۂ ارتکاز بنا۔ اسی پُرآشوب ماحول میں انھوں نے اپنی پہلی کہانی لکھی 'الگنی' جو ایک ہندو لڑکی اور مسلمان لڑکے کی پریم کہانی ہے۔ خانقاہی ماحول میں رہ کر اس طرح کی کہانی لکھنا ایک جرأت مندانہ قدم تھا۔ شائستہ فاخری کو چاروناچار لوگوں کی پھبتیاں اور طعنے سننے پڑے۔ مگر انھوں نے سوچا کہ کب تک اس خوف کے سائے میں لکھتی رہوں گی؟ اگر میں نے خوف کے اس لباس کو اتار کر نہ پھینکا تو میری تخلیقات اثر وتاثیر سے خالی رہ جائیں گی۔ بالآخر انھوں نے اس خوف کی چادر کو اتارنے کا عزم مصمم کرلیا۔ اسی دوران 1981 میں ان کی ہندی کی پہلی کتاب 'سندھی بیلا' کے نام سے چھپی۔

ایک طویل عرصے تک شائستہ فاخری ادب کے منظر نامہ سے غائب رہیں۔ 2007 میں شائستہ نے مشہور ہندی کہانی کار ریش پال کی

کہانی 'منگلا' پڑھی۔ اس کہانی میں دکھ درد کی ایسی لہریں تھیں جنھوں نے شائستہ فاخری کے باطن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ 'منگلا' ایک ایسی مظلوم عورت کی کہانی ہے جسے مصائب و آلام سہ کر اور ظلم و ستم برداشت کر کے بھی آرام میسر نہ ہو سکا اور اس کو معاشرے سے الگ تھلگ ایک چوراہے پر پھینک دیا گیا۔ منگلا کے دکھ درد نے شائستہ فاخری کو کھل کر دردمندانہ انداز میں عورتوں کے جذبات، ان کی پریشانیاں، الجھنیں اور نفسیاتی کشمکش کو بے کم و کاست بیان کرنے پر مجبور کر دیا اور انھوں نے کہانی لکھی 'منگلا کی واپسی' جو بے حد مقبول ہوئی۔ بعد میں یہ کہانی سمکالین بھارتیہ ساہتیہ میں چھپی۔ یہی وہ ٹرننگ پوائنٹ ہے جہاں سے شائستہ فاخری نے خوف و دہشت کی چادر کو اتار پھینکا اور اپنی تخلیقی سمت کا تعین کر لیا۔ وہ پے در پے کہانیاں لکھتی رہیں۔ رشتوں کی تراش، ٹھکانہ وغیرہ اسی دور کی کہانیاں ہیں جو درد، کسک اور انسانی دردمندی سے لبریز ہیں۔ 2011 میں ان کا افسانوی مجموعہ 'اداس لمحوں کی خود کلامی' منظر عام پر آیا جس کی تمام کہانیاں خوف سے آزاد ہیں۔ انسانی زندگی کا گہرا تجزیہ ان میں موجود ہے۔ وہ خود لکھتی ہیں:

''خوف و دہشت کی ساری دیواریں گر گئیں۔ بندھنوں میں جکڑی فکر پنجرے سے نکل کر پرواز کرنے لگی اور میں نے پوری یکسوئی اور تن دہی کے ساتھ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں افسانے لکھنا شروع کر دیا اور جب لکھنے کا رہنما اصول مل گیا تو یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے۔''

(میرا تخلیقی سفر، مشمولہ: اداس لمحوں کی خود کلامی، شائستہ فاخری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2011ء، ص: 12)

شائستہ فاخری افسانے کے فنی رموز سے پوری طرح واقف ہیں۔ ادب و فن سے ان کا لگاؤ بہت گہرا ہے۔ فنی شعور، تہذیب و شائستگی، کہانی پن، اختصار، وسعت مطالعہ اور گہرے مشاہدے کی بدولت ان کے افسانے قاری کو غور و فکر کی طرف مائل کرتے ہیں۔

شائستہ فاخری کی موضوعاتی کائنات بہت وسیع ہے۔ دہشت گردی، استحصال، فسادات، سیاسی داؤ پیچ، قدروں کا زوال، اخلاقی پستی، خاندانوں کا ٹوٹنا بکھرنا، غربت و افلاس، آمریت، عورتوں کا استحصال، عدم مساوات، صنفی بھید بھاؤ، نفسیاتی الجھنیں اور سیاسی، سماجی، معاشی، جنسی ہر طرح کے مسائل و معاملات کو اپنی کہانیوں میں فنی رچاؤ اور پختہ شعور کے ساتھ پیش کیا ہے۔

شائستہ فاخری کے زیادہ تر افسانے متوسط طبقے کی معاشرتی زندگی اور احوال پر مبنی ہیں۔ ان کی کہانیاں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ کرداروں کی نفسیات کا گہرا اور حقیقی تجزیہ ان کے فسانوں میں موجود ہے۔ وہ زندگی کی حرارت سے بھرپور کرداروں کا انتخاب کرتی ہیں۔ کرداروں کو ان کی گفتگو اور انہی کے اعمال کے ذریعے ظاہر کرتی ہیں۔ اپنے آس پاس کے ماحول سے کرداروں کا انتخاب کرتی ہیں اور اپنی فنی پختگی اور گہرے شعور کے ذریعے کرداروں کے نفسیاتی، جنسی اور سماجی مسائل کا تجزیہ کرتی ہیں۔ ان کے کردار حساس اور جری قسم کے ہوتے ہیں۔ سست، بے عمل اور سپاٹ کرداروں سے وہ پرہیز کرتی ہیں۔ ان کے کرداروں کے جذبات میں روانی، خیالات میں وسعت، فکر میں گہرائی ہوتی ہے۔ معاصر ماحول کی تلخی اور چبھن بھی ان کے افسانوں میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ تجسس ان کے افسانوں کا خاص وصف ہے۔ اس لحاظ سے کوکھ، صوفی آپا، انگلیوں پر گنتی کا سفر، منگلا کی واپسی، 'رشتوں کی تراش' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ دیکھیں چند اقتباسات:

''کسی جادوگر کے طلسمی تماشے کا کردار بنی وہ جل دھارا کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ اس کے دونوں گداز سینوں سے ٹپکتی ہوئی دودھ کی ننھی ننھی بوندیں جل کی دھارا میں دودھیا نقطے کی شکل میں پھیل رہی تھیں۔ چند قطرے سوکھی پیاسی زبان کی خوراک بھی بن رہے تھے۔ یہ زبان تھی اس ننھی جان کی جو پچھلے دو چار دنوں سے بستی والوں کے لیے ایک بڑا مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ ایک لاینحل مسئلہ۔۔۔۔ اپنے بازوؤں میں بچی کو سمیٹے وہ لگاتار اسے نہارے جا رہی تھی۔'' (افسانہ: کوکھ)

''آسمان کے کینوس پر کتنے مناظر ابھر رہے تھے، مٹ رہے تھے۔ مٹتے پھر سنورتے، پھر ابھرتے، صوفی آپا ان مناظر میں کھوئی ہوئی تھیں۔ بنتی بگڑتی تصویروں میں کوئی بھی تصویر ایسی نہیں تھی جو آج کی صوفی آپا سے میل کھاتی ہو۔ پچاس سال کی ایک پختہ عمر عورت، ڈھیلے ڈھالے ہاتھ سے سلے کرتے، رنگین گھیر دار بڑے پائنچے کی شلوار، سر پر پڑا ہوا ململ کا بڑا سا سفید دوپٹہ، ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایک بڑی سی تسبیح، جو جبراً ان کی انگلیوں میں پھنسا دی گئی تھی۔ عطر کی خوشبوؤں سے مہکتے ان کے کپڑے، کانوں کے کناروں میں کھونسی گئی چھوٹی سی عطر میں بھیگی روئی کی پھریری۔ کبھی کبھار عزیزن بوا کی ضد سے وہ نہ چاہتے ہوئے سرمہ آنکھوں میں لگا لیتیں۔''

(افسانہ: صوفی آپا)

شائستہ فاخری کے افسانوں کی ایک خاص خوبی اختصار بھی ہے۔

یوں تو افسانہ کہتے ہی ایسی کہانی کو ہیں جو مختصر ہو مگر اس اختصار کو جس خوبی اور استقلال کے ساتھ شائستہ نے اپنے افسانوں میں برقرار رکھا ہے اس سے ان کے گہرے شعور اور فنی پختگی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس اختصار کی بدولت ان کے افسانوں میں تاثیر کی ایسی کیفیت پیدا ہو گئی ہے جو قاری کو محظوظ کرتی ہے۔ قاری کو غور وفکر کی طرف راغب کرنا ان کے افسانوں کا امتیازی وصف ہے۔ فرد کی داخلی اور خارجی زندگی کے گوناگوں مسائل کا بیان جس خوبصورت انداز میں انھوں نے کیا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے اور بلا کم وکاست اس کا گہرا تجزیہ افسانوں میں پیش کر دیا ہے۔ شائستہ کے دوسرے افسانوی مجموعہ 'اداس لمحوں کی خود کلامی' پر اظہار خیال کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> ''یہ دیکھ کر ایک مسرت زا حیرت ہوتی ہے کہ شائستہ فاخری فن افسانہ کی تمام جہات سے پوری طرح واقف ہیں۔ ان کا ہر ایک افسانہ ایسی حیرتیں جگاتا ہے اور زندگی کے اسرار و رموز اور حالات وواقعات کا اتنا گہرا مشاہدہ لفظ لفظ اور سطر سطر سے منعکس کرتا ہے کہ قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ جیسے افسانہ نگار خود ان وقوعات کی ناظر اور حصہ رہی ہیں۔''

(شعر وحکمت، کتاب:12، دور سوم، ص765)

تحریک تانیثیت کی اولین خاتون رقیہ سخاوت حسین نے 1905 میں ایک کہانی لکھی تھی جس کا عنوان تھا 'سلطانہ کا خواب'۔ پورے ایک سو پانچ سال بعد اس کہانی کو بنیاد بنا کر شائستہ فاخری نے ایک کہانی لکھی جس کا عنوان ہے 'سنو رقیہ باجی' جو ان کی شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ کہانی کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ایک صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی سوسائٹی میں خواتین کی وہی حیثیت اور وہی مقام ہے جو پہلے تھا۔ ان کے دکھ درد ذرا بھی کم نہیں ہوئے۔ ترقی کے اس دور میں مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کے باوجود بھی عورت محفوظ نہیں۔ شائستہ فاخری نے اس دردناک حالت کو حقیقت کی نظر سے دیکھا اور کہانی میں اس کا گہرا تجزیہ پیش کیا ہے۔ کرداروں کی نفسیات کا تجزیہ جس مخصوص انداز میں شائستہ فاخری نے کیا ہے اس کو پڑھ کر حیرت واستعجاب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کہانی میں عورت، عورت ہی کے ہاتھوں بری طرح ذلیل وخوار کی جاتی ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے؟ دیکھیں یہ جملے:

> ''اٹھ کمبخت، کھانا کھا، نخرے مت دکھا۔ مر مر گئی تو تیری لاش کو کہاں ٹھکانے لگائیں گے۔ کھانا کھاتی ہے یا پھر بلاؤں دو چار مردوں کو، منٹ بھر میں وہ سب تیری کس بل نکال دیں گے۔ مر تو یہیں، اس زمین پر گڈھا کھود کر دفن کر دوں گی۔ کتیا کہیں کی، عورت کی ذات ہے یا شیطان کی اولاد۔ دو دن سے مار کھا رہی ہے مگر ٹوٹی نہیں۔'' (افسانہ: سنو رقیہ باجی)

پوری کہانی خواب کی کیفیت پر مبنی ہے۔ افسانے کی واحد متکلم خواب میں دیکھتی ہے کہ اسے بنا اس کا جرم بتائے قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں۔ اس پر الزام ہے کہ اس نے سلطانہ کے خواب چرائے ہیں۔ وہ بھری عدالت میں دفعتاً کہتی ہے کہ خواب بھی کوئی ایسی چیز ہے جو چرایا جا سکے۔ مقدمہ کی سماعت ملتوی کر دی جاتی ہے۔ اچانک اس کا خواب ٹوٹ جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اسی گھر میں موجود پاتی ہے جہاں اس نے نو سال تک مسلسل شوہر کی زیادتیاں برداشت کیں۔ مار پیٹ کر باہر نکالا گیا تو وہ اپنے بچوں کو لے کر ایک الگ مکان میں رہنے لگی۔ وہ رقیہ باجی سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔ اب وہ خواب نہیں دیکھے گی حقیقت کی دنیا میں زندگی بسر کرے گی۔

سلطانہ کا خواب کیا تھا؟ اس کا جواب شائستہ فاخری نے بظاہر جملوں میں تو نہیں دیا البتہ افسانے کی مجموعی فضا میں پس منظر کے طور پر ضرور موجود ہے۔ شائستہ فاخری کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے براہ راست اظہار سے کہیں کہیں گریز کیا ہے اور استعارہ، علامت، تمثیل، کنایہ اور مجاز کے پیرایہ اسلوب کو اپنایا ہے۔ ہندوستانی سماج اور پدر سری معاشرے میں عورتوں کو کس طرح مجبور و بے بس کر دیا گیا ہے اس کی واضح مثال ہے 'سنو رقیہ باجی'۔ زندگی بسر کرنا تو کجا! عورتوں کو اتنی بھی آزادی نہیں کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا خواب دیکھ سکیں۔ دیکھیں افسانے کے چند جملے:

> ''آپ کے نظام کا یہ کون سا کھیل ہے، جس میں کھلاڑی کوئی اور ہوتا ہے، مداری کوئی اور بنتا ہے اور شکار کس کے ہاتھوں مارا جاتا ہے، یہ پتہ ہی نہیں چلتا۔'' (افسانہ: سنو رقیہ باجی)

> ''اگر مشک کی خوشبو کو مٹھی میں باندھا جا سکتا ہے تو خواب بھی چرائے جا سکتے ہیں۔'' (افسانہ: سنو رقیہ باجی)

> ''آمنہ بی کے دروازے پر اتنے برس بیت جانے کے بعد خوشیوں نے دستک دی تھی۔ اس کا بیٹا شادی کے لیے رضامند ہو گیا تھا۔'' (افسانہ: آفندی کا بیٹا)

> ''ٹوٹی شاخ کی طرح جھکی ہوئی وہ اکیلی رہ گئی۔ کبھی شوہر کے لیے، کبھی بیٹے کے لیے۔'' (افسانہ: آفندی کا بیٹا)

> ''سوکھی مریل سی بے رونق چہرے والی روبینہ علی

ایسے کھل اٹھی جیسے تپتی دھوپ میں مرجھایا پودا بارش کی نرم پھوہاروں میں کھل اٹھتا ہے۔"

(افسانہ: اداس لمحوں کی خود کلامی)

شائستہ فاخری کی علامتی کہانیوں میں 'خوف گنبد میں روشن آنکھیں'، 'حرف حرف حساب کا دن'، 'صوفی آپا'، 'آزاد قیدی'، 'آفندی کا بیٹا'، 'اداس لمحوں کی خود کلامی'، 'سرخاب ابھی زندہ ہے'، 'کوکھ' اور 'چل گوئیاں سنگ بیٹھیں' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

'خوف گنبد میں روشن آنکھیں' ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس سے انجانے میں ایک ایسا گناہ سرزد ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس پر حد شرعی سنگسار کرنا عائد ہوتی ہے۔ سزا کا خوف اس پر اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ وہ خواب میں روز اپنے آپ کو سنگسار ہونے کے لیے پتھر جمع کرتی ہوئی دیکھتی ہے۔ کئی روز تک مسلسل ایسا ہی ہوتا ہے۔ بالآخر ایک دن وہ خواب سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آجاتی ہے۔ آنکھ کھلتی ہے تو کیا دیکھتی ہے کہ ایک بچی اس کے پاس سو رہی ہے اور پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ بھیڑ کا جمع ہونا اور اس پر پتھر پھینکا جانا سب محض خواب تھا۔ دیکھیں افسانہ کا یہ ٹکڑا:

"وہ جانتی تھی کہ وہ بے گناہ ہے اور سامنے بھیڑ جو کہہ رہی تھی یا پھر جو وہ دیکھ رہی تھی وہ پورا جھوٹ نہیں تھا۔ آج تیسرا دن تھا۔ تین راتیں اور تین دن، اس پر سے قیامت بن کر گزر چکے تھے۔ اسے سنگسار کرنے کے لیے چھوٹے بڑے پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ آدھے سے زیادہ آبادی اسے پتھروں سے لہولہان کر کے اپنے اپنے گناہوں کی معافی کی طلب گار بنی اس کے گھر کے باہر کھڑی تھی۔ ان سب کا سرغنہ جس کے حکم پر اسے سزا دی جا رہی تھی وہ بھی ارد گرد چکر کاٹ رہا تھا۔"

(افسانہ: خوف گنبد میں روشن آنکھیں)

شائستہ فاخری ان خواتین افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کے افسانوں میں کہانی پن پوری طرح موجود رہتا ہے۔ انھوں نے علامت، تمثیل اور کنایہ کے استعمال سے کہانیوں میں معنویت پیدا کی ہے۔ علامتوں کے استعمال میں فنی ریاضت اور کمال ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ کہانی کی بنت اور پلاٹ سازی کا خاص سلیقہ رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کی کئی جہتیں ایک نقطہ پر مرکوز ہو گئی ہیں۔

کہانی 'آزاد قیدی' میں علامتی اظہار کا کمال نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسے ضعیف العمر میاں بیوی کی کہانی ہے جو گھر کی اوپری منزل پر تن تنہا رہتے ہیں۔ بہو بیٹیاں اور پوتے پوتیاں سب گراؤنڈ فلور پر رہتے ہیں۔ نیچے رہنے والی اولاد ماں باپ سے ایسی بے فکر اور بے پرواہ ہے جیسے اوپر کوئی رہتا ہی نہیں۔ اپنے کاموں میں اس طرح مصروف جیسے انھیں بوڑھے ماں باپ سے کوئی سروکار نہیں۔ آج کے تناظر میں افسانے میں بیان کی گئی حقیقت ایسی ہے کہ اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اس تنہائی کے ماحول میں بوڑھے والدین کو اس کوّے کی کرخت آواز بھی میٹھی لگنے لگتی ہے جو ان کے دریچے پر بیٹھ کر تنہائی کا ساتھی بن جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ افسانہ نگار کے لفظوں میں:

"میں سوچ رہی تھی کہ کوا کیوں اڑ گیا۔ کچھ دیر اور بیٹھ کر وہ دریچے پر بولتا رہتا تو اس کا کیا بگڑ جاتا، کتنی میٹھی آواز تھی اس کی، کیوں تھی نا!!

مرد جواب دیتا ہے۔

ہاں تھی۔ بہت تھی، شاید اپنے بچوں سے بھی زیادہ۔"

(افسانہ: آزاد قیدی)

مختصر یہ کہ شائستہ فاخری عصری افسانوی ادب کا ایک اہم نام ہے۔ ان کے افسانے زندگی کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں ساتھ ہی مستقبل کی امید بھی جگاتے ہیں۔ عورت کی محرومیاں، اداسیاں، نفسیاتی الجھنیں اور اس کی داخلی و خارجی زندگی کے جملہ مسائل و معاملات کا بیان انھوں نے اپنی کہانیوں میں پوری فن کاری اور ہنرمندی کے ساتھ کیا ہے۔ خطیبانہ، واعظانہ انداز بیان سے گریز کرتے ہوئے سیدھے بیانیہ انداز میں افراد معاشرہ کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا ہے۔ افسانوی کرداروں کے ذریعے زندگی کا گہرا تجزیہ پیش کیا ہے بالخصوص عورت کے کردار اور اس کی نفسیات کے بیان میں انھیں غضب کی مہارت حاصل ہے۔

بلاشبہ شائستہ فاخری اردو افسانے میں نسائیت کی ایک معتبر آواز ہیں۔ تہذیب و تاریخ کا گہرا شعور، جدت ادا، زندگی کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ، انوکھی فکر، فنی رچاؤ، اظہار بیان کی ندرت، حقیقی کردار نگاری، نفسیاتی تجزیہ اور عام فہم زبان کے سبب ان کے افسانے انوکھی تاثیر کے حامل ہیں۔

□□□

Saddam Husain
Research Scholar
Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

درخشاں پروین

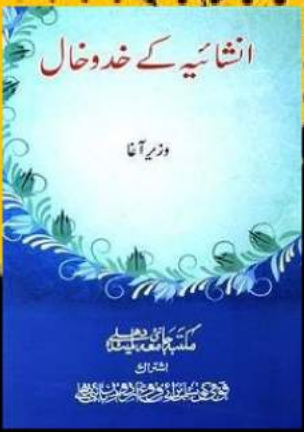

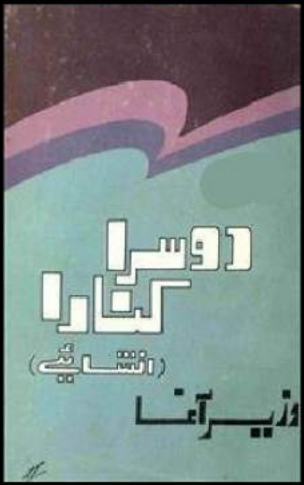

اردو انشائیے کی معنویت

اردو ادب کی جدید اصناف نثر میں انشائیہ قبولیت کا مرحلہ طے کر چکا ہے۔وقت کے ساتھ ساتھ اس کی مقبولیت کا دائرہ بھی مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔اس صنف کے خدوخال ،ہیئت واسلوب پر ناقدین ادب کھل کر اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔صنف کی حیثیت سے اس کے مختلف پہلوؤں پر مباحثوں کا سلسلہ چلتا رہا ہے۔اس کے متعلق کئی متنازعہ باتیں سامنے آئیں۔آج بھی انشائیہ کے بارے میں ناقدین اور قارئین اختلاف رائے کا شکار ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دیگر اصناف کی طرح انشائیہ کے بارے میں حتمی رائے عامہ ادب میں موجود نہیں ہے۔یعنی ہم ابھی کسی نقطہ آخر تک نہیں پہنچے ہیں۔''ابوالاعجاز صدیقی''انشائیے کے متعلق لکھتے ہیں ملاحظہ ہو:

''انشائیہ ایک اصطلاح کی حیثیت سے Essay کا ترجمہ ہے۔ پہلے پہل اسے بھی مضمون ہی کہا جاتا تھا۔لیکن مضمون ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی حدود میں سوانحی مضمون تحقیقی مقالہ حتی کہ اخبار کا مقالہ اختتامیہ بھی مضمل ہو جاتا ہے۔ مضمون کی اس قسم کے لیے کسی نئے نقطہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وزیر آغا نے انشائیہ کا لفظ تجویز کیا،جواب اصطلاح کا درجہ اختیار کر چکا ہے''۔

(کشاف تنقیدی اصطلاحات،ابوالاعجاز صدیقی 1985،ص18)

اردو انشائیہ کا لفظ انگریزی کے لفظ Essay کے مترادف کے طور پر مستعمل ہے۔Essay دراصل فرانسیسی لفظ Assai کے متبادل کے طور پر رائج ہوا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ انشا کا لفظ جس طرح عربی النسل ہے اسی طرح Assai بھی عربی لفظ اسعی کی فرانسیسی شکل ہے۔Assai کا لفظ کوشش کرنے کے معنوں میں یونانی زبان سے فرانسیسی میں منتقل ہوا لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے۔اگر ہم لسانیات کی تاریخ میں جائیں اور زبانوں کے آغاز وارتقاء کے تاریخی تناظر میں دیکھیں تو اندلس،جنوبی فرانس اور اس کے اطراف میں جتنے ممالک ہیں ان پر اہل عرب کی زبان و ثقافت کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں۔یہی وہ اسباب ہیں جن کو ہم اگر صحیح طور پر سمجھے تو بہت سے لاطینی و فرانسیسی زبان کے ابتدائی دور میں رائج بولی جن کا ہم آج تک محاسبہ نہیں کر پا رہے ہیں۔فرانسیسی میں لاطینی سے زیادہ عربی الفاظ وتراکیب کا استعمال کثرت سے پایا جاتا ہے۔ Assai عربی لفظ اسعی کا فرانسیسی املا ہے اور اس کے معنی کوشش کے ہیں۔ اب اگر اردو میں انشائیہ Essay کے متبادل کے طور پر مستعمل ہے تو معنی

کی قربت کے ساتھ ساتھ تخلیقی کوشش کے حوالے سے یہ لفظ زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔مشکور حسین یاد ، نے اس حوالے سے بہت اہم بات کہی ہے ملاحظہ ہو:

''میں انشائیہ کو ادب کی ام الاصناف کہا کرتا ہوں،انشائیہ ادب کا ایک فکری اظہار ہے۔اس لئے ہر ادیب اس کا موجد ہوتا ہے۔دنیا کی ہر زبان میں جب اس کے ادب کا آغاز ہوا تو انشائیہ وجود میں آیا''۔

(ممکنات انشائیہ،مشکور حسین یاد1983ص،18)

گویا وہ انشائیہ کو ایک صنف کے طور پر نہیں بلکہ ایک طرز اظہار کے طور پر دیکھتے ہیں جو تمام اصناف پر محیط ہے۔مندرجہ بالا تعریف کو مدنظر رکھا جائے تو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انشائیہ کا موضوع کچھ بھی ہوسکتا ہے۔اس کے لیے کوئی قید نہیں ہے۔انشائیہ کا لفظ وزیر آغا کی تحقیق کے مطابق سب سے پہلے شبلی نے استعمال کیا ہے۔جملہ انشائیہ سے مراد ایسی بات ہے جس میں سچ اور جھوٹ کا احتمال نہ ہو۔صنف کی حیثیت سے ایسا مضمون جس میں بے تکلفی ہو تحقیقی اور استدلالی انداز ہو۔اسلوب شگفتہ ہو۔انشائیہ کی کسی بھی تعریف کو حتمی نہیں کہا جا سکتا۔انشائیہ کی تحریک کے روح رواں ڈاکٹر وزیر آغا کی یہ تعریف بہت مشہور ہے:

''انشائیہ اس نثری صنف کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیا و مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور اپنی گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے''۔

(دوسرا کنارہ،ڈاکٹر وزیر آغا،سیمانت پرکاشن،نئی دہلی1985ص،8)

بہر حال انشائیہ میں تین چیزیں اساسی اہمیت کی حاصل ہیں۔یعنی اسلوب کی تازگی ہو جس سے قاری خاص و عام لطف اندوز ہو اور موضوع دلچسپ ہو کوئی منطقی اور تحقیقی موضوع نہ ہو۔خیالات نئے ہوں یا ان کا انداز بیان نیا ہونا چاہیے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے اس حوالے سے بہت اہم بات کہی ہے ملاحظہ ہو:

''تازگی سے مراد موضوع اور نقطہ نظر کا وہ انوکھا پن ہے۔جو ناظر کو زندگی کی یکسانیت اور ٹھہراو سے اوپر اٹھا کر ماحول کا از سر نو جائزہ لینے پر مائل کرے۔انشائیہ لکھنے والے کا کام یہ ہے کہ وہ ہمیں ایک لحظہ کے لیے روک کر زندگی کے عام مظاہر کے ایسے تازہ پہلو دکھاتا ہے۔جنھیں ہماری نظروں نے اپنی گرفت میں نہیں لیا اور جو ہمارے لیے گویا موجود ہی نہیں تھے''۔

(انشائیہ کے خدوخال،ڈاکٹر وزیر آغا،نئی آواز جامعہ نگر،نئی دہلی1991ص،13)

اردو میں انشائیہ نگاری کی ابتدا کب ہوئی اس سوال کے جواب میں الگ الگ بیانات موجود ہیں۔افسانہ،اور ناول کی طرح انشائیہ کو بھی مغرب سے مستعار تسلیم کیا جاتا ہے اور یورپ کے ایک ادیب مونٹین کو اس کا موجد قرار دیا گیا ہے۔جس نے اپنے خیالات کو بے تکلف انداز میں ایک مضمون کی شکل میں پیش کر کے ادب کو ایک نئے پیرائے اظہار سے نوازا جسے انگریزی میں بیکن اور ابراہم کاولی اور پھر اسٹیل،ایڈیسن،ہزلٹ اور لیمپ جیسے مایہ ناز ادیبوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے نکھار کر عالمی ادب میں پہنچا دیا۔اردو میں بھی یہ صنف عہد سرسید میں برگ و بار لائی۔اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''انشائیہ اردو ادب کی نسبتاً نوخیز صنف اظہار ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس صنف کے کچھ ابتدائی نقوش بکھری ہوئی حالت میں قدیم اردو نثر میں بھی مل جاتے ہیں۔اور یہ نقوش مصنفین کی سنجیدہ پیش قدمی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔عہد سرسید سے پہلے نثری تحریروں میں انشائیہ کے جو نقوش ملتے ہیں۔وہ اتفاقی ،غیر شعوری اور مصنفین کی انشا پردازی کی ابتدائی مثالیں ہیں''۔

(اردو انشائیہ،ڈاکٹر انور سدید1980ص،327)

انشائیہ کی حدود کے امکانات کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید کے علاوہ دیگر ناقدین نے بھی اپنی آرا پیش کی ہیں۔الغرض انشائیہ ایک صنف ہے جو اپنی طوالت،ہیئت میں دس بیس اور آدھے صفحے تک ہوسکتا ہے۔اردو انشائیہ کی تاریخ بہت قدیم ہے۔کچھ ناقدین نے ملا وجہی کی سب رس تک کو انشائیہ کا اولین نقوش بتایا ہے۔انشائیہ کے ابتدائی نقوش سرسید کے دور میں ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عہد میں مغرب میں انشائیہ اپنے عروج پر تھا اور مغرب سے ہی انشائیہ مشرق میں آیا۔سرسید نے جس عہد میں انگریزی تعلیم حاصل کی اور مغربی علوم کو اپنانے کا حکم دیا۔اس عہد میں اس صنف کا آغاز اردو میں ہوا۔سرسید اور ان کے معاصرین کے مضامین کو درحقیقت انشائیہ کا نام نہیں دے سکتے ہیں۔البتہ اس دور میں جو مضامین لکھے جا رہے تھے ان میں کچھ ایسے مضامین بھی منظر عام پر آئے جن میں انشائیہ کے عناصر پائے جاتے ہیں۔اگر اس عہد میں سرسید اور ان کے معاصرین اس طرح نئے نئے مضامین نہ لکھتے تو انشائیہ بہت پیچھے رہ جاتا۔انشائیہ کے حوالے سے سرسید کے عہد کو فراموش نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ

حتمی رائے بھی نہیں دی جاسکتی کہ سرسید پہلے انشائیہ نگار تھے۔ سرسید انشائیہ نگار نہ ہو کر مضمون نگار ضرور ہیں۔ ان کے مضامین میں انشائیہ کے عناصر ملتے ہیں۔ کچھ محققین نے سرسید ہی کو پہلا انشائیہ نگار تسلیم کیا ہے۔ جن میں سید ظہیر الدین مدنی، ڈاکٹر وحید قریشی، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا، پروفیسر نظیر صدیقی وغیرہ۔ سرسید کے کئی مضامین ایسے ہیں جو انشائیہ کے عناصر رکھتے ہیں جیسے گزرا ہوا زمانہ، امید کی خوشی، انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا اور بحث وتکرار میں انشائیہ کے عناصر ملتے ہیں۔

مرزا غالب کی نثر کا اگر جائزہ لیں تو ہمیں وہاں بھی انشائیہ نگاری کے عناصر ملتے ہیں۔ بالخصوص ان کے خطوط اس کے بین ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ جس اسلوب نگارش کی توقع ایک انشائیہ نگار سے کی جاسکتی ہے وہ یقیناً غالب کے یہاں موجود ہے۔ ان کی نثر میں انشائیہ کے مزاج سے مطابقت موجود ہے۔ لیکن موضوع کی عدم موجودگی اور دیگر مسائل کا بیان ان کو انشائیہ نگار کی فہرست میں شامل نہیں ہونے دیتا اور صنف کے اعتبار سے غور کریں تو ان کی حیثیت خطوط ہی کی ہے۔ اردو کے کئی اہم ادیب ہیں جن کی تحریروں میں بے تکلف انداز بیان، خیال آرائی، اظہار ذات اور انشائیہ کی دیگر خوبیاں نظر آتی ہیں۔

سرسید کے مضمون ''امید کی خوشی'' کو انشائیہ نگاری کا اولین نقوش سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کے متعلق تحقیق سے اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ انگریزی انشائیہ کا ترجمہ ہے۔ سرسید کے بعد کئی قلم کار ہمیں ایسے نظر آتے ہیں جن کی تحریریں انشائی خوبیوں کی حامل ہیں۔ مثلاً محمد حسین آزاد، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، میر ناصر علی، عبدالحلیم شرر، مولوی ذکاء اللہ، سلطان حیدر جوش، اکبر علی قاصد، ملا رموزی، فلک پیما، مہدی افادی، سجاد انصاری، وحید الدین سلیم، کرشن چندر، مشتاق احمد یوسفی، مجتبیٰ حسین، وزیر آغا وغیرہ۔

سرسید احمد خاں نے انگریزی انشائیہ نگار اسٹیل وراڈیسن کے طرز پر مضامین تحریر کیے تھے۔ ان دونوں انشائیہ نگاروں کے پیش نظر معاشرہ کی اصلاح کا مقصد تھا اور سرسید بھی اسی عزم کے ساتھ اٹھے تھے اس لیے ان کی تحریروں میں بھی ایک نئی سوچ ملتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کے زمانے کے معاشرتی مسائل اور برائیوں کو انھوں نے خوبصورت انداز میں اپنے مضامین میں پیش کیا اور قارئین کو غور وفکر پر آمادہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کے عہد میں بھی انشائیہ اتنا ہی بامعنی تھا جتنا آج ہے۔ اس کا سب سے اہم سبب یہ ہے کہ انشائیہ ہمیں اپنے عہد کے منظر نامے پر ایک انداز سے نظر ڈالنے اور سوچنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ان کے مضمون ''بحث وتکرار'' کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''جب کتے آپس میں مل بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل کر دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی ہوا ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے، پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے، پھر باچھیں چر کر کانوں سے جالگتی ہیں۔ اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے، داڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منھ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں۔ اور عنیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے چمٹے جاتے ہیں''۔

(مضامین سرسید، سرسید احمد خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 1972ء ص 32)

مندرجہ بالا اقتباس کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ پہلو از خود نمایاں ہو جاتا ہے کہ انگریزی سے اردو انشائیہ نگاری تک کا جو سفر شروع ہوا اس میں سرسید کی خدمات کو سراہا جائے گا۔ سرسید کے معاصرین میں محمد حسین آزاد ان کے اسلوب میں انشاپردازی کا عنصر غالب ہے۔ آزاد نے ''نیرنگ خیال'' کے دیباچے میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ یہ ان کے انگریزی مضامین کے ترجمے ہیں۔ ان کی زبان دانی، تمثیل نگاری اور خالص مشرقی ماحول نے اس طرف کسی کو متوجہ نہیں ہونے دیا۔ جبکہ محمد حسین آزاد اعلیٰ پایہ کے انشائیہ نگار تھے اور انشائیہ کے بیشتر عناصر ان کے یہاں ملتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کے بعد بیسوی صدی میں سلیم آغا قزلباش، ناصر علی دہلوی، شیخ عبدالقادر، نیاز فتح پوری، عبدالرشید، پریم چند، خواجہ حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، جیسے ادباء نے نہ صرف اپنے انشائیہ سے فرد کی زندگی کی ناہمواریوں کا احساس دلایا بلکہ اپنے تلخ وترش ردعمل سے فرد کی زندگی کی بوالعجبی کو ہنسنے کا موقع بھی فراہم کر دیا۔ اس طرح انشائیہ کا بتدریج ارتقاء ہوا اور اس کے بعد آنے والی نسلوں میں مثلاً خلیق دہلوی، سید یوسف بخاری، اشرف صبوحی، خواجہ محمد شفیع، آصف علی بھی اس ارتقائی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔

اردو انشائیہ کی عمر سوا سو سال سے بھی زائد ہے۔ مگر بحیثیت ایک منفرد نثری صنف اردو انشائیہ اپنے تمام فنی محاسن کے ساتھ بیسوی صدی کی پانچویں دہائی کی پیداوار قرار دیا جائے تو بہت سے ادیب حیرت واستعجاب کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ وہ چاہے انتظار حسین ہوں یا فیض احمد فیض ہوں سب ساٹھ سال سے پہلے اس صنف کے ابتدائی نقوش بتاتے ہیں۔ سرسید، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، کرشن چندر، یہ تمام طنز ومزاح اور

انشائیہ کے ابتدائی قبیل سے ہیں۔50 کی دہائی تک آتے آتے اردو انشائیہ نے قدیم سے جدید کی کڑیاں طے کرلی تھیں۔

1955 کے بعد اردو انشائیہ پر خصوصی توجہ دی گئی، وزیر آغا کے مضمون ''بہار کی ایک شام'' کو اردو کا پہلا انشائیہ مانتے ہیں۔وزیر آغا نے انشائیہ کو پروان چڑھایا۔اس کے بعد ان کے معاصرین نظیر صدیقی اور مشکور حسین یاد، اپنے اپنے اسلوبیاتی فرق کے ساتھ اس صنف کی آبیاری کرتے ہیں۔وزیر آغا نے ''خیال پارے''1991 نظیر صدیقی نے ''شہرت کی خاطر''1961، مشکور حسین یاد''جواہر اندیشہ''1975 میں اشاعت پزیر ہوئے۔اس کے بعد ڈاکٹر داؤد رہبر، جاوید صدیقی، غلام علی چودھری، حسنین کاظمی، ممتاز مفتی، امجد حسین، رستم کہانی کے نام اس صنف کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اس کے بعد ہمیں انشائیہ نگاروں کی ایک ایسی کہکشاں نظر آتی ہے جن کی نظر میں اس صنف کے خدوخال پوری طرح نمایاں تھے اور اس کے فنی لوازمات سے اچھی طرح واقف تھے۔ان قلمکاروں کی بیشتر تحریریں وزیر آغا کے مشہور رسالے اوراق لاہور میں شائع ہوئی۔ان میں کئی انشائیہ نگاروں کے مجموعے اور ان پر تحقیقی مقالات منظر عام پر آئے ان کے نام درجہ ذیل ہیں۔وزیر آغا، انور سدید، غلام جیلانی اصغر، جمیل آزر، سلیم آغا قزلباش، احمد جمال پاشا، رام لعل نابھوی، محمد اسداللہ، سلمان بٹ، اکبر حمیدی، حامد برگی، جان کاشمیری۔یونس بٹ، بشیر سیفی، ارشد میر محمد اقبال، انجم، رعنا تقی، انجم انصاری وغیرہ۔

اب یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ انشائیہ اور طنزیہ ومزاحیہ مضمون دو مختلف قسم کی تحریریں ہیں اور ان کے طریقہ کار بھی مختلف ہیں۔اسی طرح مضامین کی دیگر اقسام کو بھی انشائیہ سے کوئی علاقہ نہیں، گو ان میں انشائی خصوصیات کا در آنا ایک فطری امر ہے۔ایک کالم نگار عصری زندگی کے مسائل یا سیاسی ہنگامہ آرائیوں کو موضوع بناتا ہے اور انھیں ایک وسیع تناظر میں دیکھتا ہے۔طنزیہ ومزاحیہ مضامین میں سماجی بے اعتدالیوں کو ظریفانہ رنگ میں مبالغہ آرائی یا طنز واستہزا کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ظرافت میں تفریح طبع کا پہلو بھی پیش نظر ہوتا ہے۔اسی طرح ادب کی دیگر اصناف میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی جاتی ہے۔اس کے برعکس انشائیہ نگار کا طریقہ کار اور اس کے سروکار دیگر اصناف سے قدرے مختلف ہیں۔انشائیہ نگار کے طریقہ کار پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور ناقد انور سدید نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے موجودہ زمانے میں اس کی معنویت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''انشائیہ نگار اپنے عہد کے اعمال و افعال، سیاسی و سماجی تموج، فکر و نظر کے طغیان اور تہذیبی و معاشرتی کروٹوں پر ایک حساس اور تجربہ کار ادیب کی طرح نظر ڈالتا ہے۔اور عصری حقیقتوں کو نئے نئے زاویوں سے اجاگر کرتا چلا جاتا ہے۔اور یہ تمام عمل کچھ اس طرح ظہور پذیر ہوتا ہے کہ انشائیہ نگار زمانے کے مواج سمندر میں گہرے غوطہ لگانے کے لیے ہر وقت بے تاب رہتا ہے۔اور جب زمانہ اس پر اپنے اسرار چھوٹے چھوٹے جگنوؤں کی صورت میں کھولنے لگتا ہے تو انشائیہ نگار انھیں صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا بلکہ انشائیہ کی تخلیقی صورت دے کر دوستوں میں تقسیم کر دیتا ہے''۔

(انشائیہ اور عصری آگہی، انور سدید، مطبوعہ یہ ہے انشائیہ، مرتبہ محمد اسداللہ، 2017، ص53)

انشائیہ نگاری کی تحریک اور اس کے تحت ابھرنے والے مذاکرات کا ایک مثبت اثر یہ ہوا کہ انشائیہ کے خدوخال ابھر آئے۔اس صنف کو اردو میں تخلیقی بنیادیں فراہم ہوئیں۔کئی نئے قلم کار اس میدان میں داخل ہوئے اور اپنی شناخت قائم کی اور قارئین انشائیہ اور دیگر مضامین میں فرق محسوس کرکے انشائیہ کو اس کے فنی لوازمات کے ساتھ سمجھ کر اس سے محظوظ ہوسکے۔

انشائیہ میں نئی سوچ اور انشائیہ نگار کی اپنی رائے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔اس لحاظ سے ہمارے زمانے میں جب کہ موجودہ صدی بے شمار چھوٹی بڑی تبدیلیوں سے گزر رہی ہے۔ایسی صنف کی ضرورت ہے جو اس بدلتے ہوئے منظر نامے کو اپنی نظر سے ادب میں پیش کرے۔اس طرح انشائیہ عصری ادب کا ایک ایسا مبصر بن کر ابھرتا ہے جس سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ناقدین نے جن اصناف کے مستقبل میں زندہ رہنے اور پروان چڑھنے کی پیشین گوئی کی ہے ان میں انشائیہ شامل ہے اور یہی عصری ادب میں اس کے کارآمد اور بامعنی ہونے کے لیے کافی ہے۔

□□□

Darakhshan Parveen
Research Scholar
Urdu Department
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)
Mobile no:6399123321
Email.darakhshan1010@gmail.com

چھن

نصرت شمسی

اس نے اس کے کان کا جھمکا ہلایا اور اسے قریب کرنے کی کوشش کی، ''کتنی حسین لگتی ہے تو جب یہ جھمکے پہنتی ہے۔ تیری یہ چمکتی ہوئی زلفیں اور گالوں کو چھوتی لٹیں اور ہلتے ہوئے جھمکے۔ قریب آنا،''

رانو کا دل بہت زور سے دھڑکا اور وہ شبو سے دور ہوگئی۔

''ہٹ پیچھے۔'' رانو نے بکھرے ہوئے بال سمیٹے جنھیں تین دن سے کنگھا نصیب نہیں ہوا تھا اور شبو کی طرف مڑ گئی۔

''ہوں...... ایسے ہی دکھا، پہلے کچھ باتیں تو کر لے۔ وہ باتیں جو فلموں میں ہیرو ہیروئن سے کرتا ہے۔''

شبو نے جیب سے پائل نکال کر اس کے چہرے کے آگے بجائی۔

''پائل'' وہ کود کر اس کے قریب آ گئی۔

دکان پر ایک بیچنے والا آیا تو میں نے تیرے لیے خرید لی۔'' شبو نے سرگوشی کی۔

''لا پیر لا۔'' رانو نے پیر آگے بڑھا دیا۔

''چل اب آنکھیں بند کر۔'' شبو نے پائل کھولتے ہوئے کہا۔

رانو نے پائنچا تھوڑا سا اٹھایا اور پیر آگے کر دیا۔ شبو نے اسے پائل پہنا دی۔ شبو کا ہاتھ لگتے ہی اسے لگا اسے بجلی نے پکڑ لیا ہو۔

''تیرے پیر کتنے نرم ہیں۔'' شبو نے اس کے پیروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''چل ہٹ بے شرم۔''

اور وہ دوڑ کر پیڑ پر پڑے جھولے پر بیٹھ کر جھولا جھولنے لگی۔

''اور یہ دوسری پائل؟'' شبو نے پائل ہلائی۔

''یہ تم پہن لو، شادی کے بعد میں پہن لوں گی۔'' رانو نے قہقہہ لگا کر کہا۔

شبو نے پائل کو اپنی کلائی پر لپیٹا اور مسکراتا ہوا جھولے کی طرف بڑھ گیا۔

''آج موسم کتنا پیارا ہے۔'' اس نے اس کے کان میں پھر سرگوشی کی۔

''تو......؟'' رانو نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا دل اس جملے نے مزید دھڑکا دیا تھا۔

رانو نے شرارت بھری مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا، پائل پر ہاتھ پھیرا اور اسے ایک زوردار جھوٹا دیا۔

رانو تو ہمیشہ میرے ساتھ رہے گی نا''

''ہاں! اگر تم ساتھ دو گے تو ضرور۔''

دیکھ میں تجھے زیادہ عیش تو نہ دے سکوں گا۔ ہاں دو وقت کی روٹی، عزت اور تن ڈھکنے کو کپڑے ضرور دے سکتا ہوں۔ دیکھ تو بھی شادی کے بعد بدل نہ جانا۔ مجھ سے زیادہ اونچی فرمائشیں نہ کیجو، تجھے تو پتہ ہے میرے اوپر دو بہنوں کی ذمہ داری بھی ہے اور اماں کی بھی۔''

رانو نے جھولا روکا اور شبو نے اس کی رسی پکڑ لی۔

''دیکھو تمھاری بہنوں نے اگر مجھ سے زیادہ چوں چراں کی تو اچھا نہ ہوگا۔ یہ سمجھ لو۔''

''ارے نہیں ...... باجی کا تو رشتہ پکا ہو چکا ہے اور چھوٹی کے بھی رشتے برابر آ رہے ہیں لیکن چچا کا بہت دل ہے اسے اپنی بہو بنانے کا، ایک سال میں دونوں کی شادی ہو جائے گی ہاں تو اماں سے بنا کر رکھیو بس!''

"ہی......ہی ہی" رانو نے ہنس کر شبو کو دیکھا اور زور سے جھوٹا لیا۔

"اماں تو خود بڑھیا ہو چکی ہیں تمھاری، وہ میرا کیا کریں گی۔"

"رانو!" شبو نے ناراضگی والی آواز نکالی۔

"ارے مذاق کر رہی ہوں۔ وہ میری بھی اماں جیسی ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ سال میں کتنے جوڑے بنا کر دو گے مجھے؟"

"صرف دو۔ ایک چھوٹی عید پر اور ایک بڑی عید پر، بس۔"

"نہ بالکل بھی نہ، میں تو چار جوڑے بنواؤں گی۔ عید کے علاوہ، ایک گرمی کا اور ایک سردی کا۔"

"اچھا اچھا بنا دیا کروں گا۔ بس تو مجھے گھر کا سکھ دیجو۔ اچھے اچھے کھانے پکانا سیکھ لے۔ مجھے اچھے کھانوں کا بہت شوق ہے۔"

"کیا کیا پکتا ہے تمھارے گھر؟" رانو نے منھ پر آنے والی لٹوں کو پھر سے سمیٹا۔

روز ایک ہانڈی گوشت کی پکتی ہے۔ وہی دونوں وقت ہو جاتی ہے۔ دوپہر کو بہت مزے دار اور شام کو پھیکی پھیکی سی ہو جاتی ہے۔"

"اچھا ایسا کیوں؟"

"اس لیے کہ شام کو اماں اس میں پانی ملا کر پورا کرتی ہیں۔"

"اچھا۔" پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔

شبو نے کلائی پر لپٹی پائل بجائی۔

"چل آئس کریم کھاتے ہیں۔" شبو نے سامنے کھڑے آئس کریم والے کو دیکھ کر کہا۔

"نہ بابا نہ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ یہیں لے آؤ۔ کتنا سکون ہے یہاں۔ میں تو ابھی جھولا جھولوں گی۔"

اس کا دوپٹہ شبو کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ ہوا کے جھوکے سے کبھی وہ اس کے کندھوں کو چھوتا تو کبھی چہرے کو چھوتا اور شبو کا دل دھڑکاتا ہوا لہرا جاتا۔ ایک جھوٹے میں تو دوپٹہ اس کے منھ پر ہی رہ گیا اور جھولا آگے بڑھ گیا۔ شبو نے دوپٹہ اپنے گلے میں ڈال لیا اور اسے جھوٹا دیا اور رانو آسمان میں اڑ گئی۔ شبو نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور آئس کریم لینے چلا گیا۔

وہ آئس کریم لایا تو رانو مستی سے جھولا جھول رہی تھی اور کچھ گا بھی رہی تھی۔ شبو نے جھولا روکا اور اسے آئس کریم دیتے ہوئے کہا۔

"میرا دل چاہتا ہے تجھ سے کچھ اور باتیں کروں۔"

شبو نے آئس کریم چاٹتے ہوئے کہا۔

"کون سی باتیں؟" رانو نے زبان نکال کر ملائی چاٹی اور پوچھا۔

"دیکھ برا نہ ماننو، میری اور تیری باتیں......ہماری شادی کی ...... پیار کی باتیں اور......"

"چپ......بے شرم، جب وقت آئے گا تب کریں گے۔ جلدی سے اپنی بہنوں کو رخصت کرو اور مجھے لے جاؤ۔" رانو نے سرخ ہوتے گالوں کے ساتھ کہا۔

عجیب و غریب شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے ؟اس نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا۔اس کے چاروں بہن بھائی سرکاری اسکول کے کپڑے پہنے اسے زور زور سے ہلا رہے تھے۔اس نے چادر سے پیر نکال کر دیکھا لیکن وہ سونا تھا۔رفتہ رفتہ اس کے حواس واپس آرہے تھے

"......اور یہ پائل۔"

"اپنے پاس رکھو۔ اسے بھی تب ہی پہنوں گی۔ ابھی تو آئس کریم کھانے دو۔ دیکھو وہ آسمان پر اڑتے بادل اور......"

عجیب و غریب شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے؟ اس نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا۔ اس کے چاروں بہن بھائی سرکاری اسکول کے کپڑے پہنے اسے زور زور سے ہلا رہے تھے۔ اس نے چادر سے پیر نکال کر دیکھا لیکن وہ سونا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے حواس واپس آرہے تھے۔ اس نے نظریں گھما کر آنگن میں دیکھا۔ اس کی ایک سال کی ننھی سی بہن پانی میں چھپ چھپ کر رہی تھی اور اس کے ابا دروازے کے پاس پرانی سائیکل پر کچھ نئے اور کچھ پرانے ٹائر اور ایک بوسیدہ سا تھیلا لٹکائے جانے کو تیار تھے۔ پچھلے سال اس کی اماں منی کی پیدائش کے وقت پانچ بچوں کی ذمہ داری اس پر چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئیں تھیں۔ وہ بستر سے اٹھی۔ اس کے کانوں میں "چھن چھن" کی آوازیں آرہی تھیں۔ پتہ نہیں یہ آوازیں پائل کی تھیں یا کچھ ٹوٹنے کی۔

□□□

Nusrat Shamsi
Anjuman Street
Rampur-244901 (UP)

کہانی

رشدہ شاہین

احساسِ قتل

بڑے لمبے عرصے کے بعد بازاروں میں رونقیں لوٹی تھیں، مہینوں بعد لوگ اپنے گھروں سے بے خطر نکلے تھے اور آج تو معمول سے زیادہ بھیڑ لگ رہی ہے، سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم ہے لیکن سب کے سب ایک دوسرے سے بے گانہ اپنی اپنی دھن میں چل رہے ہیں۔ سب کہاں جا رہے ہیں؟ کیا پانا چاہتے ہیں؟ کس منزل کی تلاش میں ہر کوئی سرگرداں ہے؟ اسی طرح نہ جانے کتنے سوال اس کے ذہن میں آرہے تھے۔۔۔ وہ بھی تو اسی ہجوم کا حصہ ہے، سب چل رہے ہیں، بھاگ رہے ہیں وہ بھی تو چلتی جارہی ہے۔ لیکن اسے بھی کہاں جانا ہے؟ کس کی تلاش ہے؟ خود اسے اپنے سوالوں کے جواب نہیں مل رہے تھے تو لوگوں سے متعلق سوالوں کے جواب کہاں سے ملتے۔۔۔ چلتے چلتے وہ بہت تھک گئی تھی، اسے شدید پیاس بھی لگ رہی تھی آس پاس کہیں پانی بھی ملنے کی امید نہیں تھی۔۔۔ یہ کیسی سڑک ہے جہاں پانی بھی نہیں مل سکتا اس نے سوچا۔۔۔ اس کی سانسیں تیز ہوگئی تھیں اوپر سے سورج بھی سر پر تھا۔۔۔ چلتے چلتے ایک جگہ وہ رک گئی اور وہیں ایک چھوٹے سے پتھر پر بیٹھ کر اپنے چاروں طرف کا جائزہ لینا شروع کیا۔۔۔ اس کے دائیں جانب ایک بس اسٹینڈ تھا جہاں کچھ لوگ کھڑے اپنی بس کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن وہ بہت حیران ہوئی کہ سب سر جھکائے اپنے موبائل میں مصروف کھڑے ہیں۔۔۔ اس سے پہلے بھی اس نے کئی جگہ ایسے ہی موبائل میں لوگوں کو محو دیکھا تھا۔۔۔ یہاں بھی سب اس میں اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ ان کو اپنے آس پاس کا بھی ہوش نہیں تھا۔۔۔ 'احساس سے خالی لوگ۔۔۔' وہ بڑی کوفت کے ساتھ بڑبڑائی۔

پھر سر جھٹک کر بائیں جانب نظر دوڑائی تو کیا دیکھتی ہے کہ کسی عمارت کا تعمیری کام چل رہا تھا، بے شمار مزدور کام کر رہے تھے، عورتیں بھی اینٹوں کو ڈھوتی ہوئی نظر آئیں وہیں پاس میں کچھ بچے سیمنٹ، اور مٹی میں کھیلتے نظر آئے، شاید یہ ان مزدوروں کے بچے تھے۔۔۔ ارے یہ کیا ہے۔۔۔ اس نے دیکھا کوئی بھاری چیز اوپر سے آہستہ آہستہ نیچے آرہی تھی۔ جب اس نے اوپر دیکھا تو حیران رہ گئی کیوں کہ اس عمارت کی اونچائی کا اندازہ کرنے کے لیے اسے اپنے سر کو پیچھے کی طرف جھکانا پڑا صرف نظر اٹھا کر اس بلڈنگ کی آخری منزل نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اور اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اتنی اونچائی پر صرف ایک رسی کے سہارے لٹکے ہوئے لوگ کام کر رہے تھے۔ اگر رسی ٹوٹ گئی تو۔۔۔ ان کی تو کوئی ہڈی نہیں بچے گی۔۔۔ ہائے اللہ یہ تیرے بندے دو وقت کی روٹی کے لیے کس طرح اپنی جان جوکھم میں ڈالے ہوئے ہیں۔۔۔ نہیں نہیں ان کو اگر اپنی جان کی پرواہ ہوتی اور یہ احساس ہوتا کہ ان کی جان کو ہر پل خطرہ ہے تو کبھی اتنی اونچائی پر لٹک کر کام نہیں کر رہے ہوتے۔ اور یہ عورتیں۔۔۔ شاید ان کی گھر والیاں ہیں۔۔۔ ہاں یہ بچے بھی ان کے ہی ہیں۔۔۔ تبھی اوپر سے لٹکتے ایک مزدور کی رسی ٹوٹی جب اس نے اس کو گرتے ہوئے دیکھا تو اس کے منہ سے زور کی چیخ نکلی

۔۔۔'کیا ہوا؟ تم ٹھیک ہو؟ کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا؟' عائشہ اس سے پوچھے جارہی تھی اور اسے اب تک یہ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں ہے جب تھوڑا سنبھلی تو خود کو بستر پر پاکر اطمینان کا سانس لیا۔۔۔ پانی پینے کے بعد دوبارہ لیٹ گئی اور اس خواب کے بارے میں سوچنے لگی یہ کیسا خواب تھا۔۔۔ پھر اچانک چونک کر اٹھ بیٹھی۔ اسے یاد آیا کہ جس پارک میں وہ ٹہلنے کے لیے شام میں جاتی ہے وہاں بھی ایک عمارت کا تعمیری کام چل رہا تھا اور وہاں بھی مزدور اسی طرح اونچائی پر صرف ایک لوہے کی سیڑھی یا پھر رسّی پر لٹکتے ہوئے کام کرتے ہیں۔ یا اللہ اس خواب کا اس سے کوئی تعلق تو نہیں۔۔۔ اور وہ سڑک بھی جانی پہچانی لگی۔۔۔ کیا واقعی لوگوں کی بھیڑ میں وہ اکیلی ہے۔۔۔ کیا سب اتنے بے حس ہوگئے ہیں کہ آس پاس کی بھی خبر لینا کسی کو گوارہ نہیں۔۔۔ نہ جانے کتنے سوال اس کے ذہن میں آرہے تھے جو اس کی پریشانی کو بڑھا رہے تھے۔ خود کو سمجھاتے ہوئے دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگی۔

دوسرے دن شام ہوتے ہی وہ باہر نکلی اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جائزہ بھی لیتی جارہی تھی۔ ایک بس اسٹینڈ کے پاس آکر وہ ٹھٹھک گئی خواب والا ہی منظر یہاں تھا۔ وہ گھبرائی پھر آگے بھیڑ کے ساتھ چلتے ہوئے پارک کے پاس پہنچی۔ اس نے دیکھا کہ بلڈنگ پر لٹکتے مزدور کام کررہے تھے اس نے ان کو جب دیکھا تو اس کی گھبراہٹ بڑھ گئی۔۔۔ یا الٰہی ان کی حفاظت کرنا۔۔۔

'اللہ کے نام پر کچھ دے دو باجی۔۔۔' وہ چونکی، ایک چھوٹا بچہ ایک ہاتھ سے اس کا دوپٹہ پکڑے اور دوسرا ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا، وہ اس لڑکے کا جائزہ لینے لگی، 12یا13 سال کا لڑکا، گوری رنگت، گہری بڑی آنکھیں، میلے کچیلے لباس میں ملبوس وہ اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ 'تم بھیک کیوں مانگ رہے ہو تمھارے ماں باپ کہاں ہیں؟' 'ابا نہیں ہیں اور اماں بیمار ہے اور تھوڑی پاگل بھی، گھر میں اور کوئی نہیں ہے جو کمائے، اس لیے مجھے بھیک مانگنا پڑتی ہے۔۔۔' وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ 'کیا مطلب کوئی نہیں ہے اور ابا کہاں ہیں۔۔۔' اس نے پوچھا۔ 'ابا اماں کو چھوڑ گئے پھر اماں بیمار ہو گئی۔۔۔' 'میں سمجھ نہیں پا رہی اماں کو کیا ہوا۔۔۔' 'ابا اماں کو مارتا تھا ایک دن ابا نے اماں کو ڈنڈے سے مارنا شروع کیا تو اماں نے ان کو پیچھے دھکیل دیا اور ابا گر گئے ان کو سر میں چوٹ آئی پھر رات کو کہیں چلے گئے اور واپس نہیں آئے۔۔۔' 'وہ کیوں اماں کو مارتا تھا؟' 'وہ میں نہیں جانتا، جب ابا کام سے واپس آتا تو پتہ نہیں کس بات پر لڑائی ہوتی اور ابا کو غصہ آتا تو وہ اماں کو مارتا۔۔۔' 'تو تمھاری اماں کی تو جان چھوٹی نا۔۔۔ مار کھانے سے بچ گئی۔۔۔ تو پاگل کیوں ہوئی؟' اس کو اب تک سمجھ نہیں آرہا تھا کہ معاملہ کیا ہے؟ 'باجی اماں بہت خوبصورت ہے، بہت سندر۔۔۔' اس نے تو پہلے ہی اس لڑکے کو دیکھ کے اندازہ لگایا تھا کہ بڑی موہنی صورت کا مالک ہے شاید اس لیے اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ اس کی گہری اور بڑی بڑی آنکھوں سے وہ بہت متاثر ہوئی تھی۔ 'مجھے لگ رہا ہے تمھاری اماں سندر ہے، تم اس کے جیسے ہی ہونا۔۔۔' 'نہیں باجی وہ تو بہت سندر ہے۔'

دوسرے دن شام ہوتے ہی وہ باہر نکلی اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جائزہ بھی لیتی جا رہی تھی۔ ایک بس اسٹینڈ کے پاس آکر وہ ٹھٹھک گئی خواب والا ہی منظر یہاں تھا۔ وہ گھبرائی پھر آگے بھیڑ کے ساتھ چلتے ہوئے پارک کے پاس پہنچی۔ اس نے دیکھا کہ بلڈنگ پر لٹکتے مزدو رکام کر رہے تھے اس نے ان کو جب دیکھا تو اس کی گھبراہٹ بڑھ گئی... یا الٰہی ان کی حفاظت کرنا...

'اچھا پھر کیا ہوا۔۔۔ تم یہاں آؤ، بیٹھو میرے پاس، اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولی اب بتاؤ کیا ہوا؟؟' نہ جانے کس جذبے کے تحت اور احساس نے اس کی طرف متوجہ کیا اور وہ اس کی کہانی سننا چاہتی تھی۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے یا سچ؟ 'ابا جس دکان پر کام کرتے تھے اس سے اتنے پیسے ملتے تھے کہ ہم تین وقت کا کھانا کھا لیتے تھے اور میری پڑھائی بھی چل رہی تھی۔۔۔' 'ارے تم پڑھائی بھی کرتے ہو۔۔۔' 'نہیں باجی اب نہیں پڑھتا۔۔۔' 'کیوں؟؟' 'ابا چلے گئے نا جو پیسے تھے سب آہستہ آہستہ ختم ہوگئے۔۔۔' 'اوہ! تو تم کون سی کلاس تک پڑھے ہو؟' 'میں ایک سرکاری اسکول میں پڑھتا تھا جب کلاس 5 میں تھا تو ابا چھوڑ گئے تب سے میری پڑھائی بھی ختم ہوگئی۔۔۔' 'اچھا پھر کیا ہوا؟' 'ابا کے جانے کے بعد شروع میں ہمارے گھر اس دکان کا مالک آیا اور اس نے ابا کے بارے میں پوچھا تو اماں نے سب بتا دیا وہ چلا گیا۔۔۔' وہ بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔۔۔ تھوڑی دیر وہ لڑکا چپ رہا۔۔۔ 'پھر کیا ہوا بولو نا چپ کیوں ہو گئے؟' اس نے دیکھا کہ وہ تھوڑا گھبرا رہا تھا۔۔۔ 'ارے تم گھبراؤ نہیں بولو کیا ہوا؟' 'نہیں باجی آپ بھی یہ کہانی سمجھ کر سن لیں گی اور پھر کچھ

پیسے دے کر چلی جائیں گی، میری مدد تو کوئی نہیں کرتا۔ اس کی یہ بات سن کر وہ حیران ہوئی۔۔۔ارے تم ایسے کیوں سوچ رہے ہو، مجھ سے جو ہو گا میں تمھارے لیے کروں گی، اب بتاؤ کیا ہوا؟ پھر جی وہ دکان کا مالک تو اکثر گھر آنے لگا۔ میں نہیں جانتا وہ کیوں آتا تھا کیونکہ وہ آتے ہی مجھے کچھ پیسے دے کر گھر سے باہر بھیج دیتا تھا اور میں وہ پیسے لے کر چلا جاتا تھا۔ کچھ دن بعد میں نے دیکھا کہ اماں پہلے جیسے مجھ سے پیار نہیں کرتی تھی، نا ہی وہ مجھ سے باتیں کرتی تھی، رات میں سوتے وقت کہانیاں بھی نہیں سناتی تھی۔ ہر وقت وہ روتی رہتی تھی، میں جب پوچھتا تو کہتی کہ تمھارے ابا کے جانے کی وجہ سے روتی ہوں۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ایک دن دکان کا مالک آیا اور ہمیشہ کی طرح مجھے باہر بھیج دیا لیکن جب واپس آیا تو اماں آنگن میں گری پڑی تھی، دوڑ کے گیا دیکھا تو اس کے چہرے اور ہاتھوں میں چوٹ کے نشان تھے اور ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ میں پڑوس والی آنٹی کو بلا لایا انھوں نے ڈاکٹر کو بلا کر مرہم پٹی کرائی۔۔۔اس کے کچھ دن بعد اماں بیمار رہنے لگی اور اب تھوڑا پاگل بھی ہو گئی تب سے میں بھیک مانگ رہا ہوں۔۔۔اوہ یہ تو بہت برا ہوا، وہ سمجھ گئی تھی کہ ماجرا کیا ہے لیکن اس نے اس لڑکے کو کچھ نہیں بتایا۔۔۔اچھا یہ بتاؤ تم کو بھیک مانگتے کتنے دن ہوئے۔۔۔ باجی دو سال ہونے کو ہے۔۔۔دو سال؟ ابھی کہاں رہتے ہو؟ اسی گھر میں۔۔۔تم کیوں نہیں کسی دکان پر کام کر لیتے، بھیک مانگنے سے تو اچھا ہے نا۔۔۔نہیں باجی میں کسی دکان پر کام نہیں کروں گا پھر اس کا مالک بھی گھر آئے گا اور اماں کو مارے گا۔۔۔اس کی اس بات سے وہ چونکی بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔۔۔اچھا تو پھر کیا کرنا، زندگی بھر بھیک مانگنا۔۔۔نہیں باجی میں تو پڑھنا چاہتا ہوں لیکن۔۔۔وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی کہ اس کے لیے کیا کرے، اس نے اس کو غور سے دیکھا اس کے کپڑے میلے تھے، بال بکھرے تھے، آنکھوں میں امید کی کرن صاف جھلک رہی تھی کچھ پانے کا جذبہ بھی اس کی باتوں سے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اچھا یہ بتاؤ پھر تمھارے ابا کبھی نہیں آئے؟ نہیں باجی۔۔اس نے اس کو کچھ پیسے دینے چاہے۔۔۔باجی میں کہتا تھا نا کہ آپ بھی کچھ پیسے دینا اور چلی جانا۔۔۔اس نے بڑی مایوسی سے جواب دیا۔ یہ سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔۔۔تم کتنا پریشان ہوتی ہو، ایسے نہ جانے کتنے لوگ ہیں جو اس طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہیں، دو وقت کی روٹی کے لیے انھیں کیا کیا کرنا پڑتا ہے اور کچھ صرف اپنے عیش و عشرت کے لیے لوگوں کی زندگی کو ختم کر دیتے ہیں، ضمیر مر چکا ہے لوگوں کا، کسی کو کوئی احساس نہیں ہے۔۔۔تمھارے دکھ تو ان کے سوا کچھ نہیں ہیں، وہ سر جھکائے بیٹھی تھی، اب اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گود میں گر رہے تھے، وہ اپنی سوچوں میں گم ہو چکی تھی۔

یار کہاں سے یہ لوگ آ جاتے ہیں کیوں لوگ اپنے بچوں کو سڑکوں پر اس طرح بھیک مانگنے کے لیے کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔۔۔وہ اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر آئی، دیکھا تو وہی بچہ ایک لڑکے کے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا اور وہ لڑکا اس کو گالیاں دے رہا تھا۔۔۔اے بچے یہاں آؤ۔۔۔تم وہاں کیوں گئے دیکھتے نہیں سب کتنے مصروف ہیں۔۔۔باجی میں تو یہ گالیاں روز سنتا ہوں عادت ہو گئی ہے۔۔۔ہاں صحیح ہے ایسے مجبور لوگ روز نہ جانے کتنے لوگوں کے غصے اور گالیوں کا شکار ہوتے ہوں گے۔ وہ بڑبڑائی۔ باجی آپ نے کچھ کہا؟ نہیں تم یہاں بیٹھو، یہ کچھ پیسے لو اور میرے ساتھ آؤ، وہ اسے لے کر ایک ہوٹل پہنچی کچھ کھانے کی چیزیں پیک کرائی اور اس لڑکے کو دیتے ہوئے بولی۔۔۔یہ لے جاؤ اماں اور تم کھا لینا اور کل اسی جگہ آ جانا میں تمھارا انتظار کروں گی۔ ارے ہاں سنو میں نے تمھارا نام تو پوچھا ہی نہیں۔۔۔عبداللہ نام ہے میرا۔۔۔اس نے اپنا نام بتاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور چلا گیا۔

وہ واپس ہوئی اور اسی بس اسٹینڈ کے پاس آ گئی اس نے دیکھا کہ وہاں کوئی نہیں تھا وہیں بیٹھ گئی۔ اگر وہ لڑکا اس بچے کو کچھ پیسے دے دیتا تو اس کا کیا چلا جاتا۔۔۔کیوں دیتا جب اس کو کسی کی تکلیف اور مجبوری کا احساس ہو گا تب نا۔۔۔ہاں جی احساس اور ضمیر مر چکا ہے اور اسی وجہ سے انسانیت بھی ختم ہو گئی ہم سب کیسے دور میں جی رہے ہیں جہاں سب اپنے میں مگن بس بھاگ رہے ہیں۔۔۔اب اس کے خیالوں کی ٹرین اپنی پٹری پر پوری رفتار کے ساتھ دوڑنے لگی تھی، اس کا سر چکرانے لگا تھا، عجیب سی گھٹن محسوس کر رہی تھی، پھر سے اسے وحشت ہونے لگی تھی۔۔۔وہاں سے اٹھی اور سڑک پر آ کر بھیڑ کے ساتھ چلنے لگی، چلتے چلتے بہت تھک گئی تھی خود کے وجود کو گھسیٹتے ہوئے اپنے فلیٹ پہنچی اور سیدھا بستر پر دراز ہو گئی وہ اتنا تھک چکی تھی کہ اسے اپنا ہوش تک نہ تھا۔ اذان کی آواز سے وہ جاگی، سر درد سے پھٹ رہا تھا، کچھ دیر یوں ہی لیٹی رہی اچانک عبداللہ کا چہرہ سامنے آ گیا کیا کروں اس کے لیے؟ عائشہ سے بات کرتی ہوں۔۔۔اس کی اماں کے ساتھ برا ہوا۔۔۔یا اللہ میں اکثر اپنی سوچوں میں گم ہمت ہارنے لگتی ہوں تو اچانک کچھ ایسے لوگوں سے ملا دیتا ہے جن کی پریشانیوں کو سن کر تھوڑا حوصلہ ملتا ہے یا پھر کبھی کبھی ایسے جملے پڑھنے کو مل جاتے ہیں جو مجھے کافی ہمت دیتے ہیں، یقیناً یہ سب تیری طرف سے ہی ہوتا ہے، شکر ہے میرے مالک جیسے کل عبداللہ سے ملایا۔۔۔ان کے آگے میری پریشانی تو کچھ بھی نہیں

ہے، لیکن۔۔۔اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ وہ اٹھی اور نماز کے لیے وضو کرنے چلی گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ عائشہ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ کیا بات ہے؟ کیا سوچ رہی ہو؟ ہاں مجھے تم سے ایک مدد چاہیے۔۔۔وہ ٹھیک اس کے سامنے آگئی۔ ہاں بولو۔۔۔اس نے عبداللہ کی پوری کہانی اسے سنا دی۔ عائشہ بڑے غور سے سن رہی تھی۔۔۔اب تم کیا چاہتی ہو؟ میں چاہتی ہوں کہ ہم اس کی کچھ مدد کریں۔۔۔ہم کیا مدد کر سکتے ہیں، عائشہ حیران ہوئی اور تم کو اس طرح بھروسہ نہیں کرنا چاہیے ہو سکتا ہے وہ جھوٹ بول رہا ہو۔۔۔نہیں یار میں نے اس کی باتوں سے محسوس کیا کہ وہ سچ بول رہا ہے اور آج میں نے اس کو بلایا بھی ہے۔۔۔ ارے پاگل لڑکی یہ کیا کیا تم نے۔۔۔تمھاری یہی ہمدردی تمھیں تکلیف بھی دیتی ہے کیوں خطرہ مول لے رہی ہو؟ ابھی خود اتنی مشکل میں ہو۔۔۔نہیں یار ضروری تو نہیں کہ ہر بار بے حس اور ناقدرے لوگ ہی ملیں۔۔۔مجھے وہ بچہ ضرورت مند لگتا ہے۔۔۔تو ہم اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔۔۔عائشہ چڑتے ہوئے بولی۔ اب غصہ تو نا ہو، کیا تم کو نہیں لگتا کہ وہ واقعی پریشان ہے کچھ کر نہیں سکتی تو کوئی مشورہ ہی دے دو۔۔۔اسے عائشہ کی بات سن کر رنج ہوا۔ وہ روٹھتے ہوئے اپنے بیڈ پر آگئی۔ عائشہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ دوپہر کھانے کے وقت وہ عائشہ کے پاس آئی۔۔۔میں تمھارے پاس ہی آرہی تھی میری ایک دوست ہے اس سے بات کی ہے اس کی امی عبداللہ کو اپنے گھر رکھنے کو تیار ہیں جس سے وہ گھر کا چھوٹا موٹا کام لے لیا کریں گی تم اسے شام کو لے آنا۔ ارے واہ بہت شکریہ میری دوست۔۔۔وہ مارے خوشی کے عائشہ کے گلے لگ گئی۔ عبداللہ پڑھنا بھی چاہتا ہے فی الحال میں وقت نکال کر اسے کچھ پڑھا دیا کروں گی پھر آگے دیکھا جائے گا۔۔۔ٹھیک ہے تم کو جو ٹھیک لگے وہ کرو۔۔۔وہ وہاں سے اٹھی اور کمرے میں آگئی۔

وہ شدت سے شام ہونے کا انتظار کر رہی تھی شام ہوتے ہی وہ پارک میں ٹہلنے کے لیے نکلی کیا دیکھتی ہے کہ عبداللہ پارک کے باہر کھڑا تھا وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اس کے پاس پہنچی۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ باجی میں تو آپ کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں آگیا۔۔۔اچھا چلو میرے ساتھ۔۔۔وہ اسے لے کر عائشہ کے پاس آئی۔ عائشہ کے ساتھ اس کی دوست رضیہ بیٹھی تھی اس کو دیکھتے ہی عائشہ نے عبداللہ سے اس کے بارے میں پوچھا پھر رضیہ تھوڑی دیر بعد عبداللہ کو لے کر چلی گئی۔ اسے اطمینان تھا کہ عبداللہ رضیہ کے گھر کام کرے گا کیوں کہ وہ اسے جانتی تھی۔ آج بہت دنوں کے بعد پر سکون ہو کر سوئی تھی۔۔۔کچھ دن ایسے ہی گزر گئے، اب بھی وہ شام میں پارک جاتی، سڑکوں پر بھیڑ کا حصہ ہوتی، وہاں اور پارک میں لوگوں کی بے حسی دیکھ کے کڑھتی رہتی۔۔۔اکثر راستے یا پارک میں کسی کو جھگڑتے دیکھتی جہاں لوگ صلح کرانے کے بجائے محو تماشا ہوتے۔ کبھی کبھی پارک میں کسی کو اداس بھی دیکھتی تھی لیکن کسی کو یہ تک احساس نہیں تھا کہ اس سے دو گھڑی بات کر کے اس کی تکلیف کو بانٹ لیں۔ یقیناً ہم مشینی دور میں جی رہے ہیں اور خود ہم سب ایک روبوٹ کی مانند ہیں۔ جس طرح ایک مشین میں نا کوئی احساس ہوتا ہے نا کوئی جذبہ، بالکل اسی طرح یہ آج کا انسان ہو گیا ہے۔ وہ اکثر یہ سوچا کرتی۔

وہ شدت سے شام ہونے کا انتظار کر رہی تھی شام ہوتے ہی وہ پارک میں ٹہلنے کے لیے نکلی کیا دیکھتی ہے کہ عبداللہ پارک کے باہر کھڑا تھا وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اس کے پاس پہنچی۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟؟ باجی میں تو آپ کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں آگیا۔۔ اچھا چلو میرے ساتھ ۔وہ اسے لے کر عائشہ کے پاس آئی۔ عائشہ کے ساتھ اس کی دوست رضیہ بیٹھی تھی اس کو دیکھتے ہی عائشہ نے عبداللہ سے اس کے بارے میں پوچھا پھر رضیہ تھوڑی دیر بعد عبداللہ کو لے کر چلی گئی۔ اسے اطمینان تھا کہ عبداللہ رضیہ کے گھر کام کرے گا کیوں کہ وہ اسے جانتی تھی۔ آج بہت دنوں کے بعد پر سکون ہو کر سوئی تھی۔

آج کافی دنوں بعد عائشہ بھی اس کے ساتھ پارک آئی تھی، وہ آج پھر سے اداس اور چپ تھی۔ عائشہ اس سے باتیں کر رہی تھی لیکن وہ کوئی جواب نہیں دے رہی تھی۔ کیا ہوا؟ تم کچھ نہیں بول رہی، میں ہی کب سے بولے جا رہی ہوں، عائشہ اسے روکتے ہوئے اس کے سامنے آگئی۔ ارے یہ کیا؟ تم رو کیوں رہی ہو؟ تم ٹھیک ہونا؟ اس نے صرف سر ہلا دیا۔ پھر کیا بات ہے میں کچھ دن سے تمھیں ٹھیک دیکھ رہی تھی اب کیا ہوا؟ وہ بس اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ اوہ سمجھ گئی، کیا یار مجھے لگا تھا کہ اب تم ٹھیک ہو۔۔۔ آگے بڑھو، بھول جاؤ سب۔۔۔اب بھی وہ کچھ نہیں بولی بس سر کو ہلکی سی

جنبش دی۔ دیکھو جو بھی ہوا غلط ہوا میں بھی مانتی ہوں لیکن جس نے تمھیں تکلیف دی ہے ایک نہ ایک دن تو انھیں احساس ہوگا، ہوسکتا ہے کہ وہ واپس آئیں اور اپنے کیے کی معافی بھی مانگ لیں۔۔۔عائشہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

نہیں یہ احساس ان کو ہوتا ہے جن کا کوئی ضمیر ہو اور آج کل تو لوگ اس قدر بے حس ہیں کہ ان کو اپنے کیے کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی پچھتاوا۔ وہ روتے ہوئے بولی۔نہیں دوست ایسا نہیں ہے اللہ ایک نا ایک دن تو احساس ضرور دلاتا ہے تم نے مکافات عمل کا نام نہیں سنا کیا؟ اللہ خود فرماتا ہے کہ تم جیسا کرو گے ویسا پاؤ گے تو تم کو کیا لگتا ہے ظلم کرنے والے کو اللہ یوں ہی چھوڑ دے گا، نہیں وہاں انصاف کی چکی ذرا دیر سے چلتی ہے لیکن جب چل جائے نا تو انسان کہیں کا نہیں رہتا، تم مایوس مت ہو۔۔ میں مایوس نہیں ہوں، بس گھبرا گئی ہوں ان پریشانیوں سے۔۔۔اور ہاں یہ احساس جرم صرف فلموں اور ڈراموں میں ہوتا ہے جہاں آخر میں معافی مانگ کر سب ٹھیک کر دیا جاتا ہے لیکن حقیقت اس کے الٹ ہے اگر ایسا ہوتا تو لوگ ظلم اور جرم کرنا ہی چھوڑ دیں۔ کچھ لوگوں کو پچھتاوا نہیں ہوتا اور ہم صرف یہ سوچتے رہتے ہیں کہ شاید ان کو ایک دن اپنے کیے کا احساس ہو جائے لیکن ایسا نہیں ہوتا یہ صرف ان کو ہی ہوتا ہے جن کا ضمیر ابھی زندہ ہے، بے حس لوگوں کے پاس صرف اپنا آپ ہوتا ہے وہ خود کو تسلیاں دیتے ہوئے مطمئن کر لیتے ہیں کہ ہم نے کچھ غلط نہیں کیا ہے۔۔۔وہ روتے ہوئے بولے جا رہی تھی۔

'نہیں ایسا نہیں ہے ایک دن ایسا آئے گا جب ان کو احساس ہوگا ہر ظلم کا بدلہ مل کر رہے گا۔' عائشہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔'خدارا ایسا نہ کہو میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا ہمیشہ دل سے اچھا چاہتی ہوں، میری تو یہی خواہش ہے کہ وہ خوش رہیں'۔۔۔'واہ میڈم کیا کہنے تمھارے۔۔۔کیوں ایسی ہو تم ان کے جیسے ہی سخت بنو' عائشہ نے اس کی بات کاٹی، 'تم مجھے ایک بات بتاؤ تمھاری یہ تڑپ یہ بہتے آنسو یوں ہی خالی جائیں گے۔۔۔نہیں۔۔۔اگر رب کے سامنے ان کی وجہ سے آنسو بہے ہیں تو وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتے، چلو مان لو کہ وہ خوش بھی ہیں تو ان کو قلبی سکون کبھی نہیں ملے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے پچھتاوے کا اظہار کبھی نہ کریں کبھی معافی نہ مانگے تو تم مجھے بتاؤ وہ رب معاف کر دے گا؟ اے نادان لڑکی کاش وہ تمھارا دل دکھانے سے پہلے یہ سوچ لیتے کہ جو ان کا رب ہے وہی تمھارا بھی رب ہے۔ اگر تم نے اپنے خلوص و محبت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر پھر بھی تمھیں تکلیف ملی تو وہ ان کی بد نصیبی ہے تمھاری نہیں۔۔۔ یقین کرو محبت ٹھکرانے والے کو کبھی محبت پلٹ کر نہیں دیکھتی۔' اب عائشہ کو غصہ آ رہا تھا وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

'جانتی ہو کبھی کبھی ہم کسی شخص یا کسی چیز کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے لیکن پتہ ہے میں کیا سوچتی ہوں کہ ہمیں کبھی کسی کا عادی نہیں ہونا چاہیے اور نہ کسی سے اتنے مانوس ہوں کہ اگر کبھی جدا ہونا پڑے تو اذیت کی زنجیریں ہمیں جکڑ لیں، جانتی ہو یہ مانوسیت ایک نشہ ہے اور نشہ جان لیوا ہوتا ہے، ہاں نشہ انسانوں کا ہو یا کسی چیز کا انسان کو اندر تک بنجر کر دیتا ہے اور یہی حال میرا ہے۔ پتہ ہے عائشہ میں خود سے اتنی بے زار ہوگئی ہوں کہ خود سے معافی مانگنے کا دل کرتا ہے کہ لوگوں پہ بھروسہ اور امید نے مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ جانتی ہو، تکلیف تب نہیں ہوتی ہے کہ کوئی چھوڑ گیا اس وقت بہت زیادہ ہوتی ہے کہ جب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہمارے خلوص اور محبت کا بس استعمال ہوا ہے اور تب ہمارا دکھ بہت بڑھ جاتا ہے اور سمجھنے والا کوئی نہیں ہوتا نا ہی لوگوں کو اپنے کیے کا احساس۔۔۔' وہ اپنی کیفیت عائشہ کو بتا رہی تھی۔

'ہاں تو جیسے لوگ اتنے بے حس ہیں تم بھی ایسے ہی بن جاؤ'۔۔۔ 'مطلب؟' وہ حیران ہوئی۔'مطلب یہ کہ تم بھی اپنے احساس کا قتل کر دو، بس خود کا سوچو، وہی کرو جو تم کو ٹھیک لگے، دوسروں کو کیا تکلیف ہے یا کیا خوشی ہے چھوڑ دو۔۔۔' عائشہ نے اس سے دوٹوک بات کی۔ وہ حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔۔۔'ارے تم کیسی باتیں کر رہی ہو یہ میں کیسے کر سکتی ہوں احساس کا قتل، نا بابا مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ میں کسی کو تکلیف کیسے دے سکتی ہوں بلکہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتی پھر تم مجھے ایک بات بتاؤ ان میں اور مجھ میں کیا فرق رہ جائے گا۔' 'تو تم بیٹھو سارے جہان کا غم لے کر اور ایسے ہی تکلیف میں گھٹ گھٹ کر مرو میں تم کو اور نہیں سمجھا سکتی یار۔۔۔' عائشہ کو پھر سے غصہ آنے لگا تھا اور وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر جانے لگی تھی۔

'تم غصہ تو مت ہو، خدا کے لیے بیٹھ جاؤ، میں کیا کروں خود سے پریشان ہوگئی ہوں۔۔۔' اس نے بڑی بے چارگی سے جواب دیا۔'اٹھو تم یہاں سے میرے ساتھ چلو۔۔۔' عائشہ اٹھتے ہوئے بولی۔' کہاں جانا ہے؟' 'تم چلو تو میں بتاتی ہوں۔۔۔وہ دونوں پارک سے باہر آئیں۔ عائشہ اس سے مخاطب ہوئی، 'دیکھو یہاں اپنے چاروں طرف۔۔۔ یہ جو اپنی دھن میں لوگ چل رہے ہیں، بھاگ رہے ہیں، تم کو کیا لگ رہا ہے یہ سب اپنی زندگی سے بہت خوش ہیں ان کو کوئی دکھ نہیں ہوگا، ایسا نہیں ہے۔۔۔ پتہ ہے یہ لوگ حالات سے سمجھوتہ خود کو مضبوط کر کے کرتے ہیں، مشکل گھڑی میں صرف خود کو دیکھتے ہیں نا کہ ان کو جن سے دکھ ملے ہوں۔

اس غبارے والے کو دیکھو، اس کو نپ جانے کون سی مجبوری یہاں تک لائی ہے، اور دو چار پیسے کمانے کے لیے اسے روز کتنے جھوٹ اور سچ کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا اس کی مجبوری اس سے کتنے جھوٹ بلواتی ہوگی وہ کبھی یہ نہیں سوچتا ہوگا کہ اس سے کوئی کیا محسوس کرتا ہے۔۔۔اور ہاں یہ دائیں طرف جو بابا چادر بچھائے بیٹھے ہیں کیا یہ اپنی خوشی سے سرراہ بیٹھے ہیں؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔۔۔تم روز یہاں آتی ہو، میں بھی کبھی کبھی آجاتی ہوں اور اس بابا کو ہمیشہ یہاں دیکھتی ہوں لیکن میں نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ ان کی بچھی ہوئی چادر پر پیسے ہوں، کیا ان کو کوئی نہیں دیکھتا ہوگا؟ سب دیکھتے ہیں بلکہ یہاں سے روز نہ جانے کتنے لوگ گزرتے ہیں لیکن کسی نے محسوس نہیں کیا کہ ان کی ضرورت کو پورا کردے، اور لوگوں کے اس رویے کے پیچھے ایک ہی وجہ ہے کسی چیز کا احساس، جو کہ لوگوں میں مر چکا ہے۔۔۔اگر اس بھیڑ سے کسی ایک کو احساس ہو جائے کہ ان کی مدد کرنی چاہیے تو شاید یہ یہاں نہ بیٹھیں۔۔۔سن رہی ہونا کیا کہہ رہی ہوں، یہ تم اوپر کیا دیکھ رہی ہو؟' عائشہ نے دیکھا کہ وہ اوپر کچھ گھور گھور کے دیکھ رہی ہے اس نے اس کا ہاتھ کھینچا۔ 'ہاں بولو سن رہی ہوں۔۔۔'' کیا دیکھ رہی تھی آسمان میں؟؟'' کچھ نہیں تم بول رہی تھی کہ اپنے احساس کا قتل کردوں صرف خود کا سوچوں اس طرح تو ہم بے رحمی کی انتہا کو ہوں گے۔۔۔میں سوچ رہی ہوں کہ ہر مذہب میں انسانیت، محبت اور رحم دلی کو ہی اولیت دی گئی ہے پھر ایسا کیوں ہے اور آسمان کی طرف یہ سوچ کر نگاہ چلی گئی کہ وہ رب تو بہت رحم دل ہے پھر اس نے انسانوں کو اتنا بے رحم کیوں بنا دیا یار۔۔۔' اس کی باتوں میں بڑی مایوسی تھی۔ 'نہیں، یہ انسان خود ایسا بنتا ہے، فی الحال تم یہ سب مت سوچو اس پر ہم بعد میں باتیں کریں گے لیکن ابھی خدا کے لیے سب بھول جاؤ۔۔۔یہ روز تم جس ہجوم میں خود کو گم کرنے کے لیے نکلتی ہو، روز گھنٹوں چلنے کے بعد خود کو بے تحاشا تھکا کے روم پہنچتی ہو پھر تھک کر بستر پر گر جاتی ہو ایسا صرف اس لیے کرتی ہو کہ تم رات میں سو سکو، اس کے بعد صبح تک تمھیں نپ خود کا ہوش رہتا ہے نہ آس پاس کا۔ یہ سب کر کے تم خود کے ساتھ ظلم کر رہی ہو تم خود کہتی ہو کہ اللہ کو اپنے کیے کا جواب دینا ہوگا تو تم جو یہ کر رہی ہو اس کا کیا جواب دوگی۔۔۔حقیقت کو تسلیم کرو، ہر موڑ پر تم کو ایسے لوگ مل جائیں گے جن میں نا کوئی احساس ہوگا اور نہ ضمیر، ان کے رویے سے تمھیں چاہے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو بلکہ جان ہی کیوں نہ چلی جائے ان کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس لیے تم کو سمجھا رہی ہوں کہ جس نے غلط کیا بھول جاؤ وہ اپنی غلطی کا ازالہ خود کریں گے، تم اپنی جگہ صحیح ہو اس لیے تم کو اس تکلیف اور تڑپ کا ضرور انعام ملے گا، ابھی صرف دوسروں کے لیے ان کے جیسی ہی سخت بن جاؤ، اپنے دل میں ان کے لیے محبت تو کیا نفرت بھی نا رکھو، جس طرح تم نے ان کو خاص بنایا تھا اسی طرح عام بنا کر کروڑوں کی آبادی میں اس طرح گم کردو جیسے تم جانتی ہی نا تھی۔ جس طرح تم سڑکوں پر بھیڑ میں چلتے ہوئے روز سیکڑوں لوگوں کو دیکھتی ہوگی لیکن ان کے لیے نہ کوئی جذبہ ہوتا ہے نہ ہی کوئی فکر بس ویسے ہی ان کے لیے کرو جن سے تمھیں تکلیف ملی ہے۔۔۔' عائشہ اس کو سمجھا رہی تھی اور وہ چپ چاپ سن رہی تھی۔ 'چلو دیر ہو گئی ہے روم پر چلتے ہیں' اور وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئیں۔ دونوں جیسے ہی اپنی بلڈنگ کے پاس پہنچی، دیکھا کہ عبداللہ کھڑا تھا، اس کی نظر ان دونوں پر پڑی دوڑتے ہوئے ان کے قریب آگیا۔ وہ بہت خوش لگ رہا تھا، اس کے کپڑے بھی صاف ستھرے تھے، اس کی موہنی صورت کچھ ہی دنوں میں نکھر گئی تھی۔ 'باجی آپ کا بہت شکریہ مجھے کام دلا دیا، وہاں پر میں بہت خوش ہوں، گھر کے چھوٹے موٹے کام کر دیتا ہوں پھر شام میں گھر چلا جاتا ہوں۔ اماں کی دوائی کے لیے بڑی باجی نے پیسے بھی دیے ہیں، اب اماں ٹھیک ہو جائے گی۔۔۔' عائشہ اور وہ وہیں زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئیں وہ دونوں عبداللہ کو خوش دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔۔۔وہ تھوڑی دیر عبداللہ سے باتیں کرتی رہی پھر بولی۔۔۔'عبداللہ! تم روز شام کام سے فارغ ہو کر گھر جاتے ہو اب کل سے یہاں آجانا میں تم کو کچھ پڑھا دیا کروں گی۔' یہ سن کر عبداللہ کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا، مارے خوشی کے وہ اس کے قدموں میں گر گیا۔۔۔'ارے ارے یہ کیا کر رہے ہو اٹھو تمھارے کپڑے خراب ہو جائیں گے، ابھی گھر جاؤ دیر ہو گئی ہے، کل آجانا' وہ خوشی خوشی چلا گیا اس کے جانے کے بعد دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کے مسکرائیں اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس نے اپنی زندگی کا مقصد پا لیا تھا، وہ آج کافی پرسکون تھی، لوگوں کے ضمیر اور احساس مر گئے ہیں، انسانیت ختم ہو گئی ہے تو کیا ہوا اس نے سوچ لیا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔۔۔۔

□□□

Rushda Shaheen

Ph.D Scholar,Dept of Urdu

Room No: 101,LH9, South Campus

University of Hyderabad, Hyderabad

Gachibowli, T.S. 500046

Mobile no: 8125931503

rushdashaheen25@gmail.com

شاہین زیدی

غزل

دل میں اک اضطراب رہنے دو
زخم میرے گلاب رہنے دو

پیاس کا ایک دشت ہے مجھ میں
چشم کو زیرِ آب رہنے دو

اپنے احسان ہی جتاتے رہو
میرے غم کا حساب رہنے دو

میرے کچے گھڑے کی قسمت میں
ایک بپھرا چناب رہنے دو

شہر سے چھن گئی ہے بینائی
صورتیں بے نقاب رہنے دو

راہِ فرقت کا آسرا شاہیںؔ
اک ادھورا سا خواب رہنے دو

نظم

نظر نے زاویہ گم کردیا ہے
خود اپنا آئینہ گم کر دیا ہے

اچانک ایک تنکے نے لپک کر
بھنور کا دائرہ گم کر دیا ہے

ورق لہجہ بدلتے ہی کسی نے
جمال واقعہ گم کر دیا ہے

پرندے اُڑ گئے سارے شجر سے
زمیں نے ذائقہ گم کر دیا ہے

نمود ذات پر اترا رہا تھا
ہوا نے بلبلہ گم کر دیا ہے

فقط آنسو بہانا ہے مقدر
پیامِ سانحہ گم کر دیا ہے

لبوں کی بے سبب جنبش نے شاہیںؔ
حقیقی حادثہ گم کر دیا ہے

Shaheen Zaidi
Editor
Quarterly 'Nawadir'
266-E-1, Street No. 8
Jhelam Avenue, Wapda Town
Lahore (Pakistan)

یسریٰ راحت

غزل

بہاروں پہ رعنائی چھائی بہت ہے
کلی دل کی اب مسکرائی بہت ہے

کبھی چاندنی بھی تھی بے باک بیحد
وہ تعریف سن کر لجائی بہت ہے

تجھے جھوٹی تعریف کرنا ہے آتا
صداقت سے تیری لڑائی بہت ہے

لب و لہجہ میرا تو ہے تلخ لیکن
پر سچائی دنیا کو بھائی بہت ہے

اجازت اگر ہو تو سو جائے یسریٰ
کہ نینداس کی آنکھوں میں آئی بہت ہے

Yusra Rahat
11, Ghati Bharbooj
Near Chahak Nursing Home
Bhopal-462001 (M.P)

آفرین محمود

نظم

مشکل حالات سے جولڑتا ہے
بدلتے موسم سے کہاں ڈرتا ہے
اٹھتے ہیں اس کی راہ میں
لاکھ طوفان!
ملتی ہیں اسے کتنی دھمکیاں بھی
ان سب کی پرواہ کیے بغیر
اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر
اپنے جذبات کوسولی چڑھا کر
حسرتوں کا گلا دبا کر
وقت سے آنکھیں ملا کر
اپنی ڈگر پر ثابت قدم رہ کر
حقیقت کی پاسداری کرتا ہے
جب بھی اٹھاتا ہے
انقلاب لاتا ہے
بے باک صحافی وہی کہلاتا ہے

Afreen Mahmood
284, Belilious Road
Ashiyana Building
Howrah-711101 (W.B)

لذیذ پکوان

دہی بوندی چاٹ

بوندی حسب ضرورت (پانی میں بھیگی ہوئی)، آلو دو عدد (ابلے ہوئے)، دہی آدھا کلو، ہری چٹنی دو کھانے کے چمچ، ٹماٹر دو عدد، پیاز ایک عدد، پاپڑی حسب ضرورت، چاٹ مصالحہ ایک کھانے کا چمچ

مصالحہ کے لیے: لال مرچ ایک کھانے کا چمچ (کُٹی ہوئی)، زیرہ دو کھانے کے چمچ، دھنیا دو کھانے کے چمچ، نمک حسب ضرورت

بوندی کے لیے: بیسن ایک کپ، نمک حسب ذائقہ، زیرہ یا اجوائن ایک چوتھائی چائے کا چمچ (اگر ضرورت ہو تو)، پانی حسب ضرورت

املی کی چٹنی کے لیے: املی ایک کپ، پانی دو کپ، زیرہ ایک چائے کا چمچ، لال مرچ آدھا چائے کا چمچ (کُٹی ہوئی)، نمک حسب ضرورت، چینی ایک کپ

1. ایک پیالے میں دہی، ایک کپ پانی، نمک، دہی بڑا مصالحہ، لال مرچ، ہری چٹنی اور املی کی چٹنی ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔
2. اب اس مکسچر میں ٹماٹر، آلو، ہری مرچ، پیاز اور پانی میں بھیگی ہوئی بوندی شامل کردیں۔
3. پھر مکس کرکے نمک چکھ لیں اور ڈش میں نکال لیں۔
4. ٹماٹر، پیاز، آلو کے کیوبز، پاپڑی، دہی بڑا مصالحہ، چاٹ مصالحہ اور املی کی چٹنی سے گارنش کرکے سرو کریں۔
5. املی کی چٹنی کے لیے: املی کو پانی میں بھگو دیں یہاں تک کہ نرم ہوجائے۔
6. پھر اس میں نمک، چینی، کٹی لال مرچ اور زیرہ شامل کرکے کچھ دیر پکائیں۔
7. املی کی چٹنی تیار ہے۔
8. بوندی کے لیے: بیسن، نمک، زیرے اور پانی سے گاڑھا پیسٹ بنالیں۔
9. پھر گھی میں ڈیپ فرائی کرلیں یہاں تک کہ کرسپی ہوجائیں۔
10. پھر انھیں نکال کر ہوابند جار میں رکھ لیں۔
11. جب ضرورت ہو تو ایک کپ تیار بوندی کو پانی میں بھگو دیں اور نرم ہونے دیں۔

12. مصالحہ کے لیے: گرائنڈر میں نمک، دھنیا، زیرہ اور کُٹی لال مرچ ڈال کر پیس لیں۔

13. دہی بونڈی چاٹ تیار ہے۔

مصالحہ دار لوبیا

3 لال لوبیا دو پیالی (رات میں بھگولیں)، پیاز دو عدد (باریک کٹی ہوئی)، تیز پات، لہسن ادرک ایک چائے کا چمچ (چوپ کرلیں)، ہینگ آدھا چائے کا چمچ (پسی ہوئی)، ہلدی آدھا چائے کا چمچ، سفید زیرہ ایک چائے کا چمچ (پسا ہوا)، لال مرچ دو چائے کے چمچ (پسی ہوئی)، ٹماٹر دو عدد (چوپ کرلیں)، پسا ہوا گرم مصالحہ ایک چائے کا چمچ، پسا ہوا دھنیا دو کھانے کے چمچ، نمک حسبِ ذائقہ، تیل تین کھانے کے چمچ

ہرا دھنیا سجاوٹ کے لیے

1. لوبیا کو نمک اور چار پیالی پانی ڈال کر اُبال لیں اور علیحدہ رکھ دیں۔

2. دیگچی میں تیل (Oil) گرم کرکے زیرہ، تیز پات، ہینگ اور لہسن ادرک ڈال کر سنہری کرلیں۔

3. اس میں پیاز ڈال کر تلیں اور پھر ہلدی، لال مرچ، دھنیا اور ٹماٹر ڈال کر مصالحہ تیل سے الگ ہونے تک پکائیں۔

4. بھنے ہوئے مصالحے میں پانی سمیت لوبیا اور نمک ڈال کر پانی خشک ہونے تک پکائیں۔

5. پانی سوکھ جائے تو گرم مصالحہ چھڑک کر دَم پر رکھ دیں۔ مزیدار لوبیا کو ہرے دھنیے سے سجا کر پیش کریں۔

آلو کی کچوریاں

آلو آدھا کلو (اُبلے ہوئے)، نمک حسبِ ذائقہ، کُٹی لال مرچ ایک چائے کا چمچ، پسی کالی مرچ آدھا چائے کا چمچ، ثابت دھنیا ایک کھانے کا چمچ، زیرہ آدھا چائے کا چمچ، ہرا دھنیا ایک گٹھی، ہری مرچ چار سے چھ عدد، لیموں کا رس چار کھانے کے چمچ، گڑ دو کھانے کے چمچ (پسا ہوا)، پانی چار کھانے کے چمچ، میدہ آدھا کلو، بیکنگ سوڈا آدھا چائے کا چمچ اور یگانو ایک چوتھائی چائے کا چمچ

1. اُبلے ہوئے آلوؤں میں نمک، کُٹی لال مرچ، پسی کالی مرچ، ثابت دھنیا، زیرہ، ہرا دھنیا، ہری مرچ اور لیموں کا رس ملا کر پانچ سے دس منٹ کے لیے ٹھنڈا کریں۔

2. اب پین میں پسا گڑ اور پانی ملا کر دو سے تین منٹ پکائیں اور شیرہ بنالیں۔

3. پھر ایک پیالے میں میدہ، نمک، بیکنگ سوڈا، اور یگانو، گڑ کا شیرہ اور حسبِ ضرورت پانی ملا کر اچھی طرح گوندھیں اور ململ کے کپڑے سے ڈھانک کر دس سے پندرہ منٹ کے لیے رکھ دیں۔

4. اس کے بعد گندھے ہوئے میدے کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر ان میں آلو کا مکسچر ڈالیں اور کونوں کو گیلے ہاتھ کی مدد سے دَبا کر بند کردیں۔

5. پھر کچوریوں کو دس سے پندرہ منٹ کے لیے فریج میں ٹھنڈا کرلیں۔

6. اب کڑاہی میں تیل گرم کرکے کچوریاں ڈیپ فرائی کرلیں۔

7. گولڈن براؤن ہوجانے پر نکال کر گرم گرم سرو کریں۔

(بحوالہ www.khanapakana.com)

□□□

ڈاکٹر اشرف آثاری

Covid-19 کی تازہ لہر اور قوتِ مدافعت

ابھی چند دنوں کی بات ہے Covid-19 کی تازہ لہر کی خبروں نے پوری دنیا کے ممالک میں رہنے والی عوام کو انتہائی پریشانی اور ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا اور اس جان لیوا وباء سے پیدا شدہ صورت حال مزید تشویشناک بن گئی، خاص طور پر اس خبر سے کہ Covid-19 کی اس تازہ لہر میں ،بہت سرعت کے ساتھ انسانی آبادیوں میں پھیلنے کی خصوصیت موجود ہے ،جس کی وجہ سے لندن کے باشندوں کو وہاں سے بھاگتے دوڑتے ہوئے میڈیا پر دکھایا گیا۔ اکثر ممالک نے لندن سے اپنے ہوائی رابطے منقطع کر دئے اور سرحدیں بھی بند کیں، یہ بھی خبریں آ رہی ہیں کہ کئی دوسرے ممالک میں بھی کرونا وائرس کی نئی نئی قسمیں دریافت ہو رہی ہیں جو انسانی جانوں کے لیے اور زیادہ مہلک اور خطرناک ہو سکتی ہیں اور جن سے انسانی اموات کا بہت زیادہ خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

جب تک اس جان لیوا وبا کی کوئی موثر دوائی یا ویکسین دریافت نہ ہو جائے تب تک صرف اور صرف مناسب محتاط احتیاطی تدابیر اور مضبوط و مستحکم قوتِ مدافعت(Immunity) ہی اس مرض کو ہرا سکتی ہے اور کچھ نہیں۔ اس کے ویکسین کو دنیا کے کونے کونے میں بسے انسانوں تک پہنچانے کا معاملہ بھی کارِ دارد والا معاملہ ہے۔ جو فرصت طلب ہے اور اس کے لیے وقت بھی درکار ہوگا، تب تک صرف دو چیزیں اس سے نجات دلا سکتی ہیں ایک مناسب و معقول احتیاطی تدابیر اور دوسری مظبوط و مستحکم قوتِ مدافعت۔ احتیاطی تدابیر کی اس قدر تشہیر ہوئی ہے کہ اب سب لوگ ان کے بارے میں جاننے لگے ہیں۔ البتہ قوتِ مدافعت کے بارے میں بھی ایک عام انسان کے لیے ضروری باتوں کا جاننا بہت ضروری ہے۔ تاکہ اجتماعی طور پر تو ہے ہی، انفرادی طور پر بھی ملک کا عام شہری ابتدائی بچاؤ تدابیر سے آگاہ رہے اور اپنی اور دوسروں کی زندگیوں کی حفاظت احسن طریقے سے انجام دے سکے۔

قوتِ مدافعت کیا ہے؟

مناعت (Immunity) ذی روح اجسام میں موجود ایک طاقت ہے جسے قوتِ مدافعت بھی کہتے ہیں جو جانداروں کے اجسام میں بیماریوں اور امراض کے خلاف دفاع ،بچاؤ، یا پھر حفاظت کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ طب و حکمت میں Immunity کے لیے مناعت کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے۔ جو عربی الاصل ہے اور جس کا مصدر یا فعل سہ حرفی 'منع' ہے اور عربی میں منع کا مفہوم مزاحمت ،ممانعت، باز رکھنے یا خلاف کا بھی ہے۔ اس طرح سے اردو میں مناعت سے مراد، جانداروں کے اجسام میں پائے جانے والے ایک ایسے نظامِ قدرت سے لیا جاتا ہے جو کہ امراض، جن میں متعدی امراض بھی شامل ہیں، کے خلاف مدافعت یا مزاحمت پیدا کرتا ہے، مذکورہ امراض کی جسم میں داخلے کی مناسبت سے، بہت سے الفاظ لغتِ علمِ طب میں بن گئے ہیں اور مستعمل بھی ہیں۔

مدافعتی نظام کی کارکردگی:

مناعی نظام جیسے کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے، ایک ایسا نظام

ہے جس میں مناعت میں حصہ لینے والے کارکن اعضاء یا پھر کارندے مثلاً جسم میں موجود چھوٹے چھوٹے اور باریک ترین سالمات، خلیات، بیساقہ، سیلز وغیرہ شامل ہیں، جن کا بنیادی کام اپنے اور پرائے کی تمیز کر کے غیروں اور حملہ آوروں سے جسم کا دفاع کرنا ہوتا ہے اور ان سے جسم کو کسی قسم کے ضرر اور نقصان سے تحفظ فراہم کرنا ہوتا ہے۔ یہ نظام اس وقت پوری قوت و طاقت سے مستعد و متحرک ہو جاتا ہے، جس وقت کوئی دشمن یا حملہ آور مستضد (Antigen) مواد یا سیل یا جرثومہ جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کو دور بھگانا اس کا اخراج و خاتمہ کرنا اس کے افعال و فرائض میں شامل ہوتا ہے۔

تندرست قوتِ مدافعت:

اگر آپ کا جسم مختلف ذرائع سے آنے والے جراثیم کو اپنے اندر آنے اور کسی بھی قسم کے بگاڑ یا خرابی پیدا کرنے سے روکتا ہے تو اس کا مطلب یہ لیا جانا چاہیے کہ آپ کی قوتِ مدافعت صحت مند و تندرست ہے جو آپ کی حفاظت میں چٹان کی طرح کھڑی ہے اور پوری مستعدی اور ہمت و حوصلے سے جراثیم کے خلاف لڑائی میں، آپ کے جسم کی معاونت کر رہی ہے اور آپ مختلف قسم کے وائرل، بیکٹیرئل اور دیگر قسم کے جراثیم سے ہونے والے انفکشن سے محفوظ ہیں۔ یہی آپ کی قوتِ مدافعت کی تندرستی کی علامت اور نشانی ہے اور اگر معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ آپ کی قوتِ مدافعت کمزور، ناقص یا بیمار ہے۔ جسم کے مختلف اعضاء کا اپنا اپنا مخصوص کام ہے جو اسے اچھی طرح سے انجام دیتے ہیں اسی کا نام صحت ہے۔ کچھ اعضاء خون کے سفید ذرات کا اخراج بھی کرتے ہیں، جنہیں خون کے سفید خلیات کہتے ہیں۔ ان خلیات میں سیلز ہوتی ہیں کوئی بیرونی جرثومہ، وائرس یا بیکٹیریا جب جسم میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے، تو یہی سیلز جو مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں، قوتِ مدافعت کے ذریعے رکاوٹ بن جاتی ہیں اور جسم کو محفوظ بنا دیتی ہیں۔ بیکٹیریا، وائرس، سرطانی خلیات اور پیراسائٹس کے خلاف یہ خلیات، قوتِ مدافعت پیدا کرتے ہیں۔ ان مدافعتی خلیات کا اخراج تلی، گلے کے غدود، ہڈی کے گودے، لمف نوڑ وغیرہ سے ہوتا ہے۔

قوتِ مدافعت کی کمزوری:

قوتِ مدافعت کی کمزوری زیادہ تر ان افراد میں ہوتی ہے۔

1۔ جنہیں قوتِ مدافعت کی کمزوری وراثت میں ملی ہو۔
2۔ جن کی تلی کسی حادثے، مرض یا پھر ٹیومر کی وجہ سے نکال دی گئی ہو۔
3۔ خواتین میں دوران حمل میں۔
4۔ کچھ خاص امراض جیسے ذیابیطس، ایڈز، کینسر، بچوں اور ضعیف و کمزور لوگوں میں، ڈی گارج سنڈروم یا آئی جی ای عنصر کی کمی کی وجہ سے۔

قوتِ مدافعت کو کمزور کرنے والی عادات اور طرزِ زندگی:

1۔ فطری نیند میں مسلسل خلل یا کمی۔
2۔ کیموتھراپی میں استعمال ہونے والے کیمکلز۔
3۔ ناقص تغذیہ، پروٹین کی کمی وغیرہ۔
4۔ ریڈیوتھراپی کے نقصانات۔
5۔ سرطانِ خون۔
6۔ سستی اور کاہلی۔
7۔ دماغی تناؤ اور ڈیپریشن۔
8۔ شراب نوشی اور دیگر منشیات کا استعمال۔

قوتِ مدافعت کی کمی کے باعث پیدا ہونے والی بیماریاں:

1۔ آنکھوں کی سرخی۔
2۔ وائرس سے پیدا شدہ انفکشن۔
3۔ ٹھنڈ کی وجہ سے بخار۔
4۔ نزلہ و زکام۔
5۔ نمونیہ۔
6۔ ہیضہ۔
7۔ الرجی۔
8۔ نظامِ تنفس کی دیگر بیماریاں۔
9۔ تھکاوٹ۔

(یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان میں اکثر کیا بلکہ بیشتر ہی

Covid-19 کی وباء میں پائی جاتی ہیں۔)

قوتِ مدافعت میں اضافہ:۔

1۔چینی کے ترکِ استعمال سے۔

2۔زیادہ پروٹین والی غذاؤں مثلاً مچھلی، گوشت، مشروم، دالوں کے وافر استعمال سے۔

3۔ترش پھل، جن میں وٹامن سی زیادہ ہو جیسے سنگترہ ،مالٹا، انناس، لیموں وغیرہ کے استعمال سے۔

4۔باقاعدہ ورزش کے اہتمام سے۔

5۔حفظانِ صحت کے اصول وقواعد پر کار بند رہنے سے۔

6۔معالج کے مشورے سے طاقتی ادویات کے استعمال سے۔

7۔شراب نوشی، سگریٹ نوشی، اور دیگر نشہ آور چیزوں کے پرہیز سے۔

8۔بچوں کو باقاعدہ اور بروقت ویکسین وغیرہ لگوانے سے۔

9۔پریشانی اور ڈپریشن سے دور بھاگ کر حتیٰ الامکان خوش رہنے کی کوشش کرنے سے۔

10۔حاملہ خواتین اور بچوں کو متوازن خوراک کی فراہمی وغیرہ سے۔

قوتِ مدافعت کی کمی کی تشخیص:۔

1۔جسم کا ظاہری چیک اپ اور جانچ کرنے سے۔

2۔خون کی مکمل جانچ اور معالج کے مشورے پر ضروری ٹیسٹ جات سے۔

3۔ایمونوگلوبولین ٹیسٹ وغیرہ سے۔

ہومیو پیتھک نظریہ:۔

ہومیوپیتھی کے بارے میں عام طور پر یہ بات ابتدا سے ہی بتائی جاتی ہے کہ ہومیوپیتھی آپ کی قوتِ مدافعت، جسے ہومیوپیتھی میں اس سے بھی اچھے اور مناسب ومعقول نام، وائٹل پاور(Vital Power) یا وائٹل فورس(Vital Force) سے جانا جاتا ہے۔ ہومیوپیتھی (Homoeopathy) علاج بالمثل یا پھر علاج بالضد(Allopathy) کے بالکل برعکس ہے۔ اس کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے کہ یہ آپ کے وائٹل پاور یا وائٹل فورس کو اس قدر مستعد ومتحرک کر دیتا ہے کہ وہ جسم پر بیرونی حملہ آوروں، بیماری یا امراض کے خلاف صف آرا ہو جاتا ہے اور انھیں پسپا کرنے کی کوشش وسعی میں جٹ جاتا ہے اور بالآخر کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ آپ اس وائٹل پاور یا وائٹل فورس کو مناسب اور مروجہ سائنسی طور طریقوں سے متحرک ومستعد بھی کریں اور مستحکم بھی۔ کسی ماہر ہومیوپیتھ نے اس کی ایک اچھی مثال پیش کی ہے۔ کہتے ہیں کہ صحت مند جسم میں وائٹل پاور یا فورس جب تک کسی بگاڑ (یہ میازم، وراثت میں ملنے والا بگاڑ وغیرہ بھی ہو سکتا ہے) کے ساتھ اعتدال پر ہے، تو سب کچھ قدرے ٹھیک ہی ہے۔ان دونوں کی رسہ کشی کی صورت میں جب بیرونی عناصر شامل ہو جاتے ہیں، تو قوتِ مدافعت کو بہت زیادہ متحرک ہونے کی ضرورت پیش آتی ہے اور جب وہ پوری تیاری سے حملہ بولتی ہے تو اس فطری اصول کے مطابق، سب سے پہلے بیرونی عناصر یعنی کرائے کے فوجی ہی دم دبا کر بھاگ جاتے ہیں اور اس پسپائی سے جسم میں موجود ضرر رساں عناصر کی حوصلہ شکنی سے وائٹل پاور یا وائٹل فورس کی حکمرانی پھر سے قائم ہو کر صحت کامل عطا ہو جاتی ہے۔ اس لیے ہر بگاڑ بیماری، امراض یا پھر کسی ناگہانی وباء میں بھی، وائٹل پاور یا وائٹل فورس یا دوسرے الفاظ میں قوتِ مدافعت کو ہی نیند سے بیدار کرنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ اٹھئے آپ کے دروازے پر دشمن کھڑا ہے۔

ہومیوپیتھی کا آئین آرگینن (Organon) یہی بتاتا ہے جو اس کے موجد اعلیٰ ڈاکٹر ہینی من نے 1810 میں بنایا اور متعارف کرایا ہے، جو خود ایلوپیتھی میں ایم ڈی تھے جو آج تک نافض العمل ہے اور جس کی آج تک کوئی ترمیم بھی نہیں ہوئی ہے اور ہومیوپیتھی واحد طریقہ علاج ہے جس کا ایک آئین بھی ہے۔

□□□

Dr.Ashraf Aasari
Sudrabal,Hazratbal
SRINAGAR-190006
E.mail:-dr.ashraf.asari@gmail.com
Mob:-09419017246

حسن کی نگہداشت

زیتون کے تیل کے حیرت انگیز فوائد

زیتون کا تیل طبی لحاظ سے بہت فائدہ مند ہے جس کی اکثر خوبیاں آپ نے مختلف مضامین میں پڑھی ہوں گی مگر کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس سے بہت کچھ ایسا بھی کیا جاسکتا ہے جس کا آپ نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا؟ یعنی گھر کی صفائی سے لے کر جلد کی نگہداشت، فرنیچر اور بہت کچھ۔

تو زیتون کے تیل کے چند ایسے انوکھے طریقے جانے جو آپ کی زندگی کو آسان بناسکتے ہیں۔

ہیئر کنڈیشنر کے طور پر استعمال کریں

اگر آپ کے بال خشک اور نازک یا ہلکے ہو گئے ہیں تو ان میں نمی لانے کے لیے زیتون کے تیل کو استعمال کر کے دیکھیں۔ اس کے لیے آدھا کپ زیتون کے تیل کو گرم کریں (نیم گرم ابالنا نہیں) اور پھر آہستگی سے اپنے بالوں پر لگائیں۔ اپنے بالوں کو کسی پلاسٹک کے تھیلے سے کور کرلیں اور اس کے اوپر تولیہ لپیٹ لیں۔ 45 منٹ تک تولیہ لگا رہنے دیں پھر شیمپو سے دھولیں۔

جسمانی صفائی

زیتون کے تیل اور چینی کو مکس کریں اور پھر اس مکسچر کو کہنیوں اور گھٹنوں پر ہاتھ سے گوگل موشن میں مالش کی طرح مضبوطی سے پھیریں جس سے اکھٹی ہونے والی مردہ جلد ہٹ جائے گی۔

میک اپ ریموور

زیتون کا تیل قدرتی میک اپ ریموور کی طرح کام کرتا ہے، یہ وائپس کے مقابلے میں زیادہ فائدہ مند اور جلد کے لیے بہتر ہوتا ہے، خاص طور پر آئی میک اپ کو ہٹانے کے لیے بہترین ہے۔

بچوں کی نگہداشت

یہ تیل بچوں کی مالش کے لیے سب سے بہترین ہے جو ڈائپر سے پڑنے والی خراشوں اور بچوں کے سروں پر جلد کی پرت ہٹانے کے لیے قدرتی نسخے کی طرح کام کرتا ہے۔

کانوں کی صفائی

ایک یا دو قطرے زیتون کے تیل کو کان میں ڈالنے سے میل کو آسانی سے ہٹایا جاسکتا ہے، امریکن ہیئرنگ ریسرچ فاؤنڈیشن کے مطابق تیل کو کان میں کچھ منٹ کے لیے رہنے دیں، اس کے بعد اسے کسی کپڑے یا تولیے پر جھکا کر صفائی کرلیں۔

کیل مہاسوں سے نجات

ہوسکتا ہے کہ زیتون کے تیل کو جس طریقے سے چہرے پر استعمال کر کے کیل مہاسوں سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے وہ عجیب لگے مگر بیشتر ماہرین اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ چار چائے کے چمچ نمک کو تین چائے

کے چمچ زیتون کے تیل میں ملا کر ایک پیسٹ سا بنا لیں۔ اب اس مکسچر کو اپنے ہاتھوں اور انگلیوں پر انڈیل لیں اور چہرے پر پھیرنا شروع کر دیں۔ ایک یا دو منٹ تک ایسا کریں اور پھر نیم گرم پانی سے دھو لیں۔ اس طریقے کو ایک ہفتے تک روزانہ آزمائیں اور پھر اس کو ہفتے میں دو سے تین بار تک محدود کر دیں۔ آپ کو اپنے چہرے پر نمایاں بہتری نظر آئے گی۔

چکنے ہاتھوں کی صفائی

اگر ہاتھوں میں گاڑی کی گریس یا پینٹ لگ جائے تو ایک چائے کا چمچ زیتون کا تیل اور ایک چائے کا چمچ نمک یا چینی اپنے ہاتھوں پر انڈیل لیں۔ اس مکسچر کو مضبوطی سے ہاتھوں پر کئی منٹ تک رگڑیں پھر صابن اور پانی سے دھو لیں۔ نہ صرف آپ کے ہاتھ چکنائی سے پاک ہو جائیں گے بلکہ نرم بھی ہو جائیں گے۔

بالوں پر لگ جانے والے پینٹ کو ہٹانا

اگر کسی وجہ سے گھر میں یا کمرے میں رنگ کرتے ہوئے پینٹ آپ کے بالوں میں لگ جائے تو اس سے جان چھڑانا آسان نہیں ہوتا۔ تاہم اگر آپ زیتون کے تیل سے روئی کی کچھ مقدار کو بھگو کر نرمی سے اپنے بالوں پر پھیریں تو یہ کام آسانی سے ہو جاتا ہے۔ یہی چیز آنکھوں کے گرد مسکارا صاف کرنے کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے مگر یہاں روئی کی جگہ کسی ٹشو کا استعمال کرنا ہوگا۔

فرنیچر کی پالش بنائیں

اپنے لکڑی کے فرنیچر کی چمک دمک بحال کرنے کے لیے ایک محلول تیار کریں جس میں دو حصے زیتون کا تیل اور ایک حصہ لیموں کا عرق یا سفید سرکہ ہو، جسے ایک اسپرے بوتل میں ڈال کر اچھی طرح ہلائیں اور پھر فرنیچر پر اسپرے کریں اور ایک یا دو منٹ تک مکسچر اس پر لگا رہنے دیں، اس کے بعد کسی صاف کپڑے یا تولیے سے صاف کر لیں۔

اپنی پرانی گیند کو دوبارہ نیا جیسا کریں

اگر تو آپ کرکٹ کے پرستار ہیں اور اپنی پرانی ہارڈ بال کو دراڑوں سے محفوظ اور اس کے چمڑے کو سخت رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی نئی زندگی کے لیے کچھ عرصے بعد زیتون کے تیل کو استعمال کریں۔ بس زیتون کے تیل کو کسی نرم کپڑے کے ساتھ گیند کے خشک حصوں پر پھیریں اور پھر اسے تیس منٹ تک چھوڑ دیں اور پھر صاف کپڑے سے صاف کر لیں۔

چمڑے اور اسٹین لیس اسٹیل کی پالش

زیتون کے تیل کی کچھ مقدار کپڑے پر لگا کر لیدر، اسٹین لیس اسٹیل کی مصنوعات کو پالش کیا جا سکتا ہے، جو بالکل نئی کی طرح چمکنے لگتے ہیں اور اس سے آپ کچن سنک کو بھی جگمگا سکتے ہیں۔

اسٹیکر ہٹائیں

شیشے کے برتنوں پر لگے اسٹیکر ہٹانا چاہتے ہیں تو زیتون کے تیل کو کسی کپڑے پر لگا کر رگڑیں وہ بہت جلد ہٹ جائے گا۔

چمچوں کو چمکائیں

کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کو پکانے یا کھانے کے بعد چمچ کو صحیح طرح صاف کرنا مشکل ہوتا ہے، تو ایسے چمچ کو زیتون کے تیل میں ڈبو دیں، اس پر جم جانے والی اشیاء خود ہٹ جائیں گی۔

(بحوالہ:www.kfoods.com)

تاثرات: نگر نگر سے

ماہنامہ ’خواتین دنیا‘ کافی عرصے سے میرے مطالعہ کا حصہ ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد رسالہ ہے۔اس رسالے میں خواتین سے متعلق مضامین جو کہ خواتین کی ہی لکھی تخلیقات ہوتی ہیں، شائع کیا جاتا ہے۔اردوادب کے ساتھ ہی ساتھ نسائی ادب کی بقا میں اس ماہنامہ کا بہت بڑا تعاون ہے جو قابل تحسین اور قابل فخر ہے۔دسمبر 2020 کا خواتین دنیا میری نظر سے گزرا، مشمولات پر نظر پڑی۔پچھلے شمارہ کی طرح یہ شمارہ بھی معلومات پر مبنی ہے۔حقانی القاسمی کا رخسانہ نازنین سے لیا گیا انٹرویو معلوماتی ہے۔ رخسانہ نازنین کی نظر عورتوں کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر مرکوز ہے۔درمیان انٹرویو حقانی القاسمی صاحب نے جو سوالات کیے، چاہے وہ فیمینزم کے متعلق ہو، عورت کے ذہنی وجسمانی اعتبار سے متعلق ہوں یا مسلم معاشرے کی خواتین کی تعلیم ،صحت اور انصاف کی برابری کی بات، social conservatism سے ہو یا ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ممتاز علی، مولانا حالی کی تعلیم نسواں کی جستجو وغیرہ ہر پہلو پر رخسانہ نازنین صاحبہ نے خواتین کی ہر صورت حال پر بڑی بے باکی سے جواب دیا ہے، جو واقعی بہت متاثر کرتا ہے مثلاً ’’آوارگی کا تعلق فطرت سے ہے صنف سے نہیں‘‘ یا ’’عورت کی محفوظ پناہ گاہ اس کا گھر ہے اور شوہر اس کا محافظ‘‘۔شخصیت کے ذیل میں عبدالسمیع کا مضمون دیا گیا ہے جو ’مسلم نشاۃ ثانیہ کی عظیم رہنما ’بی اماں‘ سے متعلق ہے۔مضمون نگار نے ’بی اماں‘ کی شخصیت کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے۔شاعرات کے منتخب اشعار بھی مجھے پسند آئے۔ جہان نسواں کے تحت پانچ مضامین شامل ہیں۔تمام مضامین اپنی جداگانہ نوعیت اور انفرادی اہمیت کے حامل ہیں۔ ’’اردو غزل کی نسائی آوازیں‘‘ ڈاکٹر نغمہ پروین صاحبہ نے بڑے سلیقے سے مضمون قلمبند کیا ہے۔انھوں نے بیسوی صدی کی چند معروف شاعرات کے نسائی ادب پر گفتگو کرتے ہوئے ان کی ادبی کاوشوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔کہانیوں میں شامل دونوں کہانیاں ’کچے رنگوں کی محبت‘ اور ’کہاں تم چلے گئے‘ معلومات کا خزانہ اور دل کو موہ لیتی ہیں۔ حسن سخن میں شامل نازیہ ناز اور آبگینہ عارف کی دو نظمیں ’دیوی‘، اور ’خودی‘ بہت عمدہ ہے۔خواتین دنیا ایک ایسا رسالہ ہے جس سے تعلیمی سرگرمیوں سے وابستہ خواتین کے ساتھ ہی گھریلو خواتین بھی بخوبی لطف اندوز ہو سکتی ہیں۔ پکوان اور صحت سے متعلق مواد ہر کسی کی معلومات میں اضافہ کا سبب بن سکتا ہے۔ سلیس اور شائستہ انداز و بیان اس کی خاص خوبی ہے۔غرض یہ رسالہ ہر اعتبار سے مکمل اور کامیاب رسالہ ہے۔

صوفیہ محمود (ریسرچ اسکالر) شعبہ عربی، فارسی، اردو ومطالعہ اسلامی، بھاشا بھون، وشو بھارتی یونیورسٹی، شانتی نیکیتن، مغربی بنگال

□□□

مہ جبین ایورسٹنگ چیلنج مکمل کرنے والی پہلی ہندوستانی خاتون

ممبئی۔11 جنوری (ایو این آئی) ہندوستان میں مسلمانوں اور بالخصوص مسلم خواتین کی صلاحیتوں پر سوال اٹھانے والوں کو مہاراشٹر کی ایک مسلم خاتون ایتھلیٹ مہ جبین نے ایورسٹنگ رننگ چیلنج (ای آر سی) Everesting Running Challenge کو کامیابی سے مکمل کرنے والی پہلی ہندوستانی بن کر ایک کرارا جواب دیا ہے۔ایورسٹنگ چیلنج کے منتظمین نے بتایا کہ ممبئی سے متصل تھانے ضلع کی مہ جبین نے ایورسٹنگ رننگ چیلنج کو مکمل کرنے والی پہلی ہندوستانی خاتون ہونے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ای آر سی کی رائے گڑھ میں چھوٹے پہاڑی اسٹیشن پر جمعہ کی شام سے 5 شوقیہ کھلاڑیوں کے ایک گروپ کے ذریعہ کی گئی کوشش اتوار کی صبح دو بجے تک مکمل ہوئی۔ جس میں 37 سالہ مہ جبین ایس اجمان والا نے اتوار کی صبح میں مکمل کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔اس گروپ کے کوچ 29 سالہ منیش جیسوال نے ہفتہ کی دیر رات گئے اسے مختصر ترین وقت میں اسے ختم کر کے ایک نیا قومی ریکارڈ اپنے نام کیا۔ایورسٹنگ رننگ چیلنج ایک سخت آزمائشی دوڑ ہے، جس میں شرکاء کو 8849 میٹر (8.85 کلومیٹر) یا ہمالہ کی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ کی بلندی کے مماثل لگاتار اور بغیر رکے ہوئے دوڑنا پڑتا ہے۔دنیا کے 526 رنرس نے اسے مکمل کیا ہے جن میں 36 خواتین شامل ہیں۔اس فہرست میں ابھی تک صرف تین ہندوستانی شامل تھے۔ تاہم اب منیش جیسوال اور مہ جبین اجمان والا کی کامیابی کے بعد تعداد 5 ہو

گئی ہے اور دنیا بھر کے ایتھیلیٹس کی تعداد 528 تک پہنچ گئی ہے۔مہ جبین نے 34 گھنٹے 39 منٹ میں 92 کلومیٹر کی دوڑ لگا کر 9948 میٹر کی بلندی حاصل کی۔جیسوال اور اجمان والا دونوں میں ماؤنٹ ایورسٹ کی بلندی کی مطلوبہ سطح 8849 میٹر سے کہیں زیادہ ریکارڈ کی گئی۔

(روزنامہ منصف، حیدرآباد، 12 جنوری 2021)

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

قومی پالیسی برائے تعلیم 2020

وزارت تعلیم، حکومت ہند

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 116

قیمت: 35روپے

بھارت کا آئین

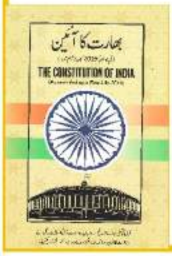

چھٹی اشاعت: 2019

صفحات: 515

قیمت: 330روپے

اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ

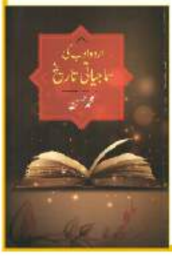

مصنف: محمد حسن

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 334

قیمت: 160روپے

آج کے عالمی تناظر میں اردو کا تحفظ اور فروغ

مرتب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 467

قیمت: 240روپے

گرونانک: حیات وخدمات

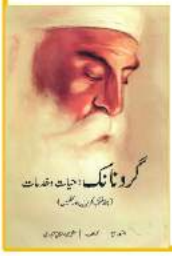

مرتبین: اختر الواسع، محمد حبیب

مفتی محمد مشتاق تجاروی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 190، قیمت: 110روپے

دربارِ اکبری

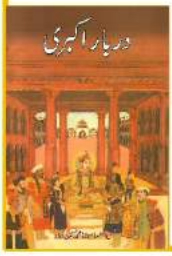

مصنف: شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد

تیسری طباعت: 2020

صفحات: 1070

قیمت: 475روپے

راسخ عظیم آبادی: کلاسیکیت، شعریت اور انفرادیت

مصنف: ثاقب فریدی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 422

قیمت: 200روپے

حیاتیاتی تنوع اور ماحولیات کے مسائل

مصنف/مترجم: حافظ شائق احمد یحییٰ

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 132

قیمت: 90روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly February 2021, Vol. 5 , Issue: 2
RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education , Department of Higher Education, Government of India

بھارت سوچھ
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025